باسمہٖ تعالیٰ

اسلامی نظام

کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟

قوموں کیلئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے خدائی!

پرویز

شائع کردہ - ادارہ طلوع اسلام - کراچی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 86487
MAILSI

مشمولات

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

تشکیل پاکستان کے بعد سب سے پہلا سوال جو لوگوں کے دل میں پیدا ہوا یہ تھا کہ اس مملکت کا نظام کیسا ہوگا۔ چونکہ مملکت کی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور انہوں نے حصول پاکستان میں دلچسپی ہی اس نظریہ کے ماتحت لی تھی اس لئے اس سوال کا جواب واضح تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہونا چاہیئے۔ کہنے کو تو یہ بات بڑی آسان سی نظر آئی لیکن اس کے بعد جب یہ سمجھنے کی باری آئی کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں اور وہ کس طرح مرتب ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس سوال کا جواب ایسا آسان نہیں تھا جیسا نظر آتا تھا۔ اس پانچ سال کے عرصہ میں اسلامی نظام کی تعبیر کے متعلق اس قدر مختلف، متضاد اور گوناگوں آوازیں بلند ہوئی ہیں کہ ساری فضا ایک شور اور ہنگامہ سے بھری ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ اس کثرت تعبیر کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہوتا جا رہا ہے۔

اس شور اور ہنگامے میں ہمارے سامنے ایک ایسی فکر بھی آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غنائے فکر نے اس مسئلہ پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا ہے اور اس کے تدبر فی القرآن نے اسے

ایک ایسا صاف اور نکھرا ہوا حل دیدیا ہے جس کے پیش نظر اس مسئلہ میں کوئی الجھاؤ اور کوئی پیچیدگی، باقی نہیں رہتی۔ یہ فکر ہے محترم پرویز صاحب کی جنہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ قرآن، تاریخ، فلسفہ، سیاست مدن اور علوم حاضرہ میں غور وفکر پہ صرف کیا ہے۔ انہوں نے یہ بتایا کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ اس نے چند چیزوں کے سوا زندگی کے مسائل کے متعلق اصول بیان کئے ہیں اور اس چیز کو قرآن کی حامل اور وارث امت کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود متعین کرے۔ اس طرح قرآن کے اصول ابدی طور پر غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی جزئیات زمانہ کے احوال وظروف کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔ اس کا نام اسلامی نظام ہے۔

محترم پرویز صاحب نے اسلامی نظام کے متعلق یہ ایسا اہم اور بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جس سے ملت اسلامیہ کی وہ تمام پیچیدگیاں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں جنہوں نے امت میں اس قدر انتشار اور افتراق پیدا کر رکھا ہے اور جن کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ دنیا دن بدن آگے بڑھ رہی ہے اور یہ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ چونکہ دورِ حاضر کے مسلمانوں کیلئے پرویز صاحب کی آواز غیر مانوس سی ہے اس لئے کہ یہ آواز ان آوازوں کے خلاف ہے جسے مسلمان صدیوں سے سنتا چلا آرہا ہے اس لئے ہمارے موجودہ معاشرہ میں اس کی مخالفت غیر طبعی نہیں۔ بایں ہمہ محترم موصوف کی مسلسل تگ وتاز اور پیہم پکار نے ایسے لوگ بھی پیدا کر دیئے ہیں جو ان مسائل پر غور وفکر کرنے لگے ہیں۔ یہ حلقہ دن بدن وسیع

ہو رہا ہے اور اس سے ہمیں توقع ہوتی ہے کہ اگر اس سلسلہ میں مزید جدوجہد کی جائے تو کوئی عجب نہیں کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایسی فضا پیدا ہو جائے جو اس نظام کے لئے سازگار ہو جسے قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے اور جس کی طرف محترم پرویز صاحب دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں۔

اسلامی نظام کے متعلق محترم پرویز صاحب کے مضامین طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ارباب نظر کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کی بنا پر ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ ان کی عام اشاعت ہو سکے۔ واضح رہے کہ ان مقالات میں اسلامی نظام کا اصول بیان کیا گیا ہے اس کی عملی جزئیات نہیں دی گئیں۔ جہاں تک عملی جزئیات کا تعلق ہے دستور پاکستان کی تدوین کے سلسلہ میں طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں دو چیزیں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں ایک وہ تنقید جو قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پہ شائع ہوئی تھی اور دوسرے وہ مسودۂ دستور پاکستان جو حکومت کی عمومی دعوت پر مرتب کر کے مجلس دستور ساز کو بھیجا گیا تھا۔ افادۂ عام کے پیش نظر ان مضامین کو بھی الگ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ادارۂ طلوع اسلام قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا مرکز ہے۔ اگر آپ اس فکر سے متفق ہیں تو ہم متوقع ہیں کہ آپ اس نور بصیرت کے عام کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے۔

کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء   والسلام   ناظم ادارۂ طلوع اسلام

باسمہٖ تعالیٰ

اسلامی نظام

غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے طلوع اسلام میں "شخصیت پرستی" کے عنوان سے میرا ایک مبسوط مضمون شائع ہوا۔ اس میں میں نے بتایا تھا کہ اسلامی نظام زندگی میں قرآن، احادیث اور فقہ کی صحیح حیثیت کیا ہے اور انہیں کس مقام پر رکھنا چاہیئے۔ چونکہ مسلمانوں کا اکثر و بیشتر مسلک یا رواۃ پرستی ہے یا ائمہ پرستی۔ اور میرے مضمون میں خالص "خدا پرستی"⁽¹⁾ کی طرف دعوت دی گئی تھی اس لئے ان کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت لازمی تھی۔ اس لئے بھی کہ عجمی تصورات، جو اس شخصیت پرستی کے ذمہ دار ہیں، مسلمانوں کے دل و دماغ پر صدیوں سے مسلط ہو رہے ہیں اور ان کے اثرات، ان کے خون کے ذرات تک میں سرایت کر چکے ہیں۔ ان کا ازالہ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ معتقدات خواہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں، انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں اور وہ اس متاعِ گراں قدر کے چھننے میں سخت صدمہ محسوس کرتا ہے۔ بنابریں اس دعوت کی مخالفت اور بھی شدید ہوئی۔ حتیٰ کہ میرے بعض قریبی دوستوں نے

(1) خدا پرستی سے مقصود خدا کو پوجنا نہیں بلکہ خالص قوانین خداوندی کی اتباع ہے۔

اس سے متاثر ہو کر مجھ سے کہا کہ تم نے اس نظری بحث کو کیوں چھیڑ دیا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بحث نظری نہیں ہے۔ نظری بحثوں میں الجھنے کے لئے میرے پاس وقت کہاں ہے۔ بقول اکبر:-

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ وہ زمانہ تھا جب حصول پاکستان کی تحریک جاری تھی۔ اس تحریک سے میری اور دیگر ہمنوا حضرات کی وابستگی اس بنا پر تھی کہ ہمارے نزدیک اس خطۂ ارض میں اسلامی نظام زندگی کی از سر نو ترویج کے امکانات تھے۔ ہر چند اس وقت یہ توقع کسی کو بھی نہ تھی کہ پاکستان اتنی جلدی مل جائے گا، لیکن یہ امید تو تھی کہ کسی نہ کسی دن یہ شید کامرانی ہمارے لئے فردوس گوش ضرور بنے گی۔ میرے سامنے سوال یہ تھا کہ تشکیل پاکستان کے بعد سب سے پہلا قدم اسلامی نظام حکومت کی ترتیب و تدوین کا ہو گا۔ ضروری تھا کہ اس کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا جائے اور اس کے راستے میں جو الجھاؤ اور پیچیدگیاں حائل ہونے والی تھیں انہیں رفتہ رفتہ صاف کر دیا جائے تاکہ جب اس نظام کی عملی تشکیل کا وقت آئے تو اس کی ترتیب میں دقت پیش نہ آئے۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس وقت کثرت تعبیر سے یہ خواب پریشاں سے پریشان تر ہو جائے اور جس طرح ترکوں نے ان ہی دشواریوں سے تنگ آکر، نظام شریعت کو ناممکن العمل سمجھ لیا اور اپنے آئین و دساتیر کے نقشے معماران مغرب سے مستعار کر لئے،

ء چنانچہ تجربے نے بتا دیا کہ تشکیل پاکستان کے بعد تدوین دستور اساسی کے ضمن میں یہی کچھ ہوا (اور ہو رہا ہے)

یہاں بھی ایسا ہی نہ ہو جائے اور ہم نے پاکستان سے جس قدر امیدیں باندھ رکھی ہیں، وہ موہوم خواب اور نگاہ فریب سراب سے زیادہ ثابت نہ ہوں۔ لہذا میں نے جو بحث چھیڑی تھی وہ نظری بحث نہ تھی بلکہ یکسر عملی نتیجہ کی طرف لے جانے والے مذاکرات تھے چنانچہ آج اسلامی نظام کی تشکیل و ترویج کے متعلق جو آوازیں چاروں طرف سے اٹھ رہی ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ بحث یکسر عملی حیثیت لیئے ہوئے تھی۔

اسلامی نظام، نہایت سیدھے سادے اصولوں پر قائم اور آئینۂ فطرت کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اس میں کہیں کثافت نہیں، ٹیڑھ نہیں، سلوٹ نہیں جھول نہیں۔ ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفوت جن چیزوں کے اندازے خدا نے مقرر کر دیئے ہیں ان میں کہیں نقص و تفاوت نہیں ہوا کرتا۔ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور جدھر جی چاہے نگاہ اٹھا کر دیکھ لیجئے کہیں کسی گوشے اور کونے میں بھی فطور نظر نہیں آئے گا۔ ایک بار نہیں بار بار نگاہ اٹھا کر دیکھو ینقلب الیک البصر خاسئا و ھو حسیر۔ ہر بار نگاہ ناکام و نامراد کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی اور کہیں کوئی الجھاؤ نہیں پائے گی جس قدر الجھاؤ اور پیچیدگیاں، جتنی دشواریاں اور پریشانیاں جس قدر اختلافات و نزاعات، جتنی فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں ہیں سب ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں ؎

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اسلامی نظام کی بنیاد

اسلامی نظام کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اسی اصل الاصول میں احترامِ آدمیت اور انسانی مساوات کا راز پوشیدہ ہے۔ اطاعت صرف قانونِ خداوندی کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔ حکومت کا حق صرف احکم الحاکمین کے ضابطۂ قوانین کو ہے اس میں کوئی شریک و سہیم نہیں ولا یشرك فی حكمه احدًا (کہف)

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اس باب میں قرآن کریم کی تعلیم ایسی صاف اور واضح ہے کہ اس کے متعلق کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں۔ چونکہ اس وقت میرا خطاب مسلمانوں سے ہے جن کا اس حقیقت پر ایمان ہے، اس لئے مجھے اس کے متعلق بھی کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ حکومت کا یہ اصول کس طرح نوعِ انسانی کو داخلی اور خارجی کشمکش سے نجات دلا کر حریت و آزادی کی صحیح فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں انسانیت بڑھتی پھولتی اور پھلتی ہے۔ اس وقت مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ اسلام میں حکومت اور اطاعت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ وہ ہر فرد کو براہ راست تو کوئی حکم دیتا نہیں نہ ہی ہم سے ہمکلام ہوتا ہے۔ پھر اس کی اطاعت کا

ذریعہ کیا ہے؟ اس کا جواب بھی صاف اور واضح ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جن قوانین کی اطاعت چاہتا ہے اس نے وہ قوانین بوساطت جناب نبی اکرمؐ انسانوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ ان ہی قوانین و ضوابط کے مجموعہ کا نام قرآن ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بار بار صراحت کردی ہے کہ اس کی اطاعت قرآن کی اطاعت سے ہوگی لہذا اسلامی نظام حکومت کی اساس قرآن کی اطاعت ہے۔ حکومت اسی کے مطابق قائم کی جائے گی۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) "ان میں قرآن کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم کرو"۔ جو ایسا نہ کرے اسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) جو قرآن کے مطابق (جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم نہ کرے تو وہ کافر ہے"۔

قرآن کا انداز

قرآن خدا کی طرف سے آخری کتاب ہے جو انسانوں کو دی گئی ہے۔ اب غور کیجئے کہ چھٹی صدی عیسوی سے لے کر جب قرآن نازل ہوا، قیامت تک کس قدر مختلف زمانے آئیں گے اور ان زمانوں میں کس قدر مختلف، طبقات کے لوگ ہوں گے۔ قرآن، تمام نوع انسانی کے لئے، تمام زمانوں کے لئے، خدائی حکومت کا جامع ضابطۂ قوانین ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں انسانوں کی تمدنی زندگی (Social Life) کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں انسانوں کے طریق بود و ماند اور اسلوب معاش و معاشرت بدلتے رہتے ہیں۔ آج وسائل آمد و رفت کی وسعتوں سے ساری دنیا کی طنابیں کھنچ

گئی ہیں جس سے انسانوں کے بین الاقوامی روابط و معاملات اس نہج و انداز کے ہو گئے ہیں کہ ہزار سال قبل اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج دنیا کی کوئی قوم خود مکتفی (Self-sufficient) اور دوسروں سے مستغنی (Independent) نہیں ہو سکتی - لہذا ظاہر ہے کہ عصر حاضر کے تمدنی تقاضے ازمنۂ سابقہ کے تقاضوں سے مختلف ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے۔ لہذا ان میں مرور زمانہ سے تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً انسان کی طبیعی زندگی کو لیجئے جس طرح چھٹی صدی عیسوی کے زمانے کے انسان کی پیاس پانی سے بجھتی تھی اسی طرح آج کے انسان کے پیاس کی تسکین بھی پانی ہی سے ہوتی ہے۔ یا جہان ذوق و نظر (Appreciative World) میں جس طرح نزہت و لطافت ہزار سال پہلے کے انسان کے لئے وجۂ شادابیِ قلب و نگاہ تھی، اسی طرح آج کے انسان کے لئے بھی باعثِ شگفتگیِ دیدہ و دل ہے - اسی اصول کے تابع، جس طرح صداقت و دیانت ہزار سال پہلے کے انسان کے لئے باعث فخر و مباہات تھی اسی طرح آج کے انسان کے لئے بھی وجہ تکریم و تفضیل ہے - ان چیزوں پر زمانے کی تبدیلی کا کچھ اثر نہیں ہوتا - لہذا ظاہر ہے کہ

(۱) انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے اور مرور وقت سے ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۲) لیکن اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے تقاضے ایسے ہیں جو زمانے کی ضروریات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

لہذا جس ضابطہ، قوانین وضوابط کو تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے نظامِ زندگی بننا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ان ہر دو تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ کسی خاص وقت اور خاص قوم کے لئے ہی نظامِ زندگی بن سکے گا۔ چونکہ قرآن ایک ایسا نظامِ حیات پیش کرتا ہے (دین کے معنی ہی نظامِ حیات ہیں)، جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے اور زمان ومکان کی حدود سے بلند۔ اس لئے اس میں انسانی زندگی کے ان بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی اس میں

(۱) بعض اصول ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی متعین کر دی گئی ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جن پر مرورِ زمانہ کا کچھ اثر نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لئے ناقابل تغیر وتبدل ہوں گے، ایسے احکام بہت تھوڑے ہیں۔

(۲) باقی اصول ایسے ہیں جن کی صرف حدود متعین کر دی گئی ہیں۔ جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ ان کی جزئیات ہر زمانے کے انسان اپنی اپنی ضروریات (یعنی اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں) کے مطابق خود متعین کریں گے۔ اس شرط کے ساتھ کہ یہ جزئیات ان حدود سے متصادم نہ ہوں۔

مثلاً قرآن میں زانی، سارق، ڈاکو، باغی کی سزا متعین ہے۔ جب کوئی انسان

بلا وصیت مرجائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو تو تقسیم ترکہ کے حصے مقرر ہیں۔ حرام حلال کی تعین موجود ہے۔ نکاح کے محرمات کا تفصیلی ذکر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات کی تعین سے منشاء خداوندی یہی ہے کہ ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ دوسری طرف، مثلاً نظام اقتصادیات میں قرآن نے ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ روپیہ کی گردش اس طرح ہونا چاہیئے کہ وہ محض اوپر کے طبقے میں ہی نہ پھرتا رہے کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (۵۹/۱) یہ ایک محکم اصول ہے جو بطور اصول قیامت تک کے لئے کار فرما رہ سکتا ہے لیکن وہ جزئی قواعد جن سے یہ مقصد حاصل ہو مختلف زمانوں میں بدلتے رہیں گے۔ اس لئے قرآن نے ان کی تفاصیل و جزئیات سے بحث نہیں کی۔ یا مثلاً محاصل حکومت Govt. tAXES کے سلسلے میں اس نے زکوٰۃ کا ذکر بار بار کیا ہے۔ لیکن سارے قرآن میں دیکھ جائیے کہیں بھی اس کی شرح (Rate) مقرر نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ شرح، مختلف زمانوں میں حکومت کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہے گی۔ زکوٰۃ کی شرح کو بلا تعین چھوڑ دینے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ اس کی شرح حکومت اسلامی اپنی ضروریات کے مطابق خود متعین کرلے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس کے اصول کی طرح اس کی شرح بھی ناقابل تغیر ہوتی تو قرآن نے جہاں اتنی مرتبہ زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہے وہاں ایک دو آیتوں میں اس کی شرح کا تعین

[1] زکوٰۃ کی شرح و حقیقت کے متعلق میرا ایک مبسوط مضمون طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے، اسے ایک نظر ضرور دیکھ لینا چاہیئے۔

بھی کر دینا۔ اللہ کے لئے یہ کونسی مشکل بات تھی؟

لہذا یہ ظاہر ہے کہ جن اصولوں کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، اس سے منشاءِ ایزدی یہی ہے کہ ان کی جزئیات مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق اولتی بدلتی رہیں گی۔ اس لئے اپنے اپنے زمانے کی قرآنی حکومت اُن کی تفاصیل خود طے کرلے گی۔ ان جزئیات کا نام شریعت ہوگا۔ یعنی قانونِ حکومتِ اسلامی۔ پھر سمجھ لیجئے کہ شریعت، یعنی قانونِ حکومتِ اسلامی مشتمل ہوگی۔

(۱) ان ناقابلِ تغیر جزئیات پر جو قرآن نے خود متعین کردی ہیں اور جو معدودے چند ہیں۔ اور

(۲) ان تفاصیل و جزئیات پر جو قرآنی اصولوں کے دائروں کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانہ کی ملتِ اسلامیہ قرآنی قاعدوں کے مطابق خود وضع کریگی۔
اس خاکے کو سامنے رکھ کر آگے بڑھئے۔

پہلی قرآنی حکومت

قرآن نازل ہونے کے بعد سب سے پہلی حکومت خداوندی نبی اکرمؐ نے متشکل فرمائی اس کے لئے حضورؐ نے

(۱) ان احکام کو بجنسہٖ نافذ فرمایا جو قرآن میں بالتفصیل آئے ہیں۔ یعنی جن کی جزئیات قرآن نے متعین کردی ہیں۔ اور

(۲) جن اصولوں کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، ان کی جزئیات اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین فرمائیں۔ اُس زمانے میں ہنوز

تمدنی دست اتنی زیادہ نہ تھی جو مختلف النوع معاشرتی اقتضایات کا موجب بنتی۔ وہ سیدھا سادہ دور تھا اس لیئے اس میں تفصیلی احکام کی ایسی کثرت نہ تھی جیسی بعد میں جا کر ہوئی۔ لہذا حضور کی متعین فرمودہ جزئیات بھی کچھ زیادہ نہ تھیں۔

ان دونوں کے مجموعے کا نام شریعت اسلامی، یا ضابطہ قوانین حکومت خداوندی تھا۔ اس ضابطہ کی اطاعت حکومت حقہ کی اطاعت یعنی خدا اور رسول کی اطاعت تھی۔ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کو نہایت محفوظ شکل میں لکھوا کر، اور حفاظ کو حرف بحرف یاد کرا کر اور ان کا یاد کیا ہوا خود سُن کر، امت کے حوالے کر دیا۔ اور خود اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱) "ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ باقی رہیں وہ جزئیات جو شق ۲ کے مطابق حضور نے اپنے زمانوں کے تقاضوں کے پیش نظر خود متعین فرمائی تھیں۔ چونکہ وہ ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لیئے متعین نہیں کی گئی تھیں۔ اس لیئے حضور نے نہ اُن جزئی احکامات کو کہیں قلمبند کرایا نہ انہیں کسی کو حفظ یاد کرایا، نہ اُن کا کوئی مجموعہ امت کو دیا، اور چونکہ صحابہ کبارؓ اس حقیقت سے واقف تھے اس لیئے نہ انہوں نے اس کا مطالبہ کیا اور نہ ہی کسی ایسے مجموعے کو مدون کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ کتب تاریخ و آثار اس پر شاہد ہیں کہ نبی اکرمؐ نے امت کو قرآن کے سوا اور کوئی مجموعۂ احکام نہیں دیا۔ اور مذکورہ صدر تصریحات کی روشنی میں اس کی لِم بھی صاف

طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ

جن اصولوں کی جزئیات کو ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل رکھنا منشائے خداوندی نہ تھا، ان جزئیات کو ابدی طور پر غیر متبدل رکھنا منشائے نبی اکرمؐ کس طرح ہو سکتا تھا؟ اس لئے رسول اللہ نے انہیں محفوظ کر کے اُمت کو نہیں دیا۔

رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے فیصلوں میں اختلاف

ظاہر ہے کہ جب یہ چیز نہ منشائے خداوندی تھی اور (لہٰذا) نہ منشائے رسول اللہ تو حضورؐ ان جزئیات کو قرآن کی طرح محفوظ کر کے، امت کو کیوں دیتے رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ حضورؐ کے جانشین ہوئے (خلیفہ کے معنی جانشین ہیں) اب قرآنی اصولِ حکومت کے مطابق، حضرت صدیق اکبر کے فیصلوں کی اطاعت "خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مترادف ہوگئی۔ چونکہ آپ کے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں بُعد نہیں تھا اور دونوں کے تمدنی مقتضیات قریب قریب ایک ہی تھے اس لئے عام طور پر نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلیوں کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ لیکن بایں ہمہ جن معاملات میں کسی تبدیلی کی ضرورت لاحق ہوئی ان میں تبدیلی بھی کی گئی اور جو نئے امور و قضایا سامنے آئے ان میں نئے فیصلے بھی دیئے گئے۔ کتب روایات و آثار میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ نے ایسے فیصلے صادر کئے جو نبی اکرمؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں سے مختلف تھے۔ امور حکومت میں سب سے

اہم معاملہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ حضورؐ نے نہ کسی کو اپنا جانشین منتخب کیا تھا نہ نامزد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اہل مدینہ کے انتخاب سے خلیفہ مقرر ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا اور حضرت عمرؓ نے انتخاب کو چھ حضرات میں محدود کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ فیصلے رسول اللہؐ کے عمل سے مختلف تھے۔ یعنی رسول اللہ کا عمل یا فیصلہ یہ تھا کہ خلافت کے معاملہ میں بالکل خاموش رہا جائے اور انتخاب کا معاملہ اُمت پر چھوڑ دیا جائے۔ یا مثلاً حضرت عثمانؓ نے جمعہ کی نماز میں دوسری اذان کا اضافہ کیا۔ اسی طرح شراب خوری کی سزا کا تعین نہ قرآن میں ہے نہ حضور کے زمانے میں اس کی تعیین ہوئی۔ اسے حضرت عمرؓ نے صحابہ رضؓ کے مشورے سے متعین کیا حضرت عمرؓ کے متعلق کتب آثار میں ہے کہ آپ نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دیدیں تو وہ طلاق بائنہ مان لی جائیگی[۱] تو آپ کو معلوم تھا کہ رسول اللہؐ ایسی طلاق کو بائن قرار نہیں دیتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے اسے نافذ قرار دیا اور فرمایا کہ لوگوں نے جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کے پیش نظر اب یہی حکم مناسب ہے۔ چنانچہ یہ حکم نافذ العمل ہوا اور شریعت کا

---

[۱] مجھے اس وقت حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلہ سے بحث مقصود نہیں۔ اس وقت تو صرف اتنا بتانا ہے کہ اصولی طور پر خلفائے راشدین اس حقیقت سے آشنا اور اس پر عمل پیرا بھی تھے کہ نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ جزئیات ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے وضع نہیں کی گئی تھیں (طلاق کی صحیح قرآنی صورت کیا ہے اس کے متعلق الگ تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

حکم قرار پا گیا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک حکم، حکم شریعت تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کے برعکس دوسرا حکم، حکم شریعت قرار پا گیا۔ اور اس وقت اسی حکم کی اطاعت "اطاعت خدا اور رسول" مانی گئی۔ چنانچہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ

> عہد عمرؓ کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو بائنہ مان کر فیصلہ کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کر کے آپ نے تحلیل کا دروازہ بند کر دیا تاکہ لوگ حلالہ سے باز رہیں۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کا یہ حکم کہ دوران جنگ میں کسی مسلمان پر شرعی حد جاری نہ کی جائے اور جنگ قادسیہ میں سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شراب پینے پر معاف کر دینا یا حضرت عمر کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانہ میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے جو حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا۔ قبیلہ مزنیہ کے ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ حاطب کے غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دیا۔ پھر فوراً ہی آپ کو تنبہ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا اور انہیں بھوکا مار دیا اور اس حال تک پہنچا دیا کہ کوئی شخص حرام چیز بھی کھالے تو اس کے لئے جائز ہو جائے۔ یہ کہہ کر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلا دیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ

حالات کے بدلنے سے کس طرح شریعت کے فیصلے بدلتے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور فیصلہ بھی ہے نبی اکرمؐ نے لوگوں کے وظائف مساوی مساوی مقرر فرمائے تھے۔ یہی طریق حضرت ابوبکرؓ نے بھی جاری رکھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس فیصلہ کو بدل کر یہ فیصلہ کیا کہ وظائف لوگوں کی خدمات اسلامی کے مطابق مقرر کئے جائیں۔ چنانچہ اس فیصلے کی رو سے مختلف لوگوں کے وظائف مختلف قرار پاگئے۔ یہ فیصلہ رسول اللہ کے فیصلے سے بالکل مختلف تھا۔ جس طرح طلاق ثلاثہ والے مقدمے میں حضرت عمر کا فیصلہ رسول اللہ کے فیصلے سے مختلف تھا، لیکن حضرت عمر نے اپنے فیصلے کو نافذ فرما دیا۔ اور یہی فیصلہ شریعت کا حکم قرار پاگیا۔

نئے فیصلے اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مملکت میں توسیع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ تمدنی ضروریات میں بھی وسعت ہوگئی اور ایسے ایسے امور اجتماعیہ سامنے آئے جو نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں پیش نہ آئے تھے چنانچہ ان معاملات و قضایا کے متعلق نئے نئے احکام وضع کرنے پڑے مثلاً دفاتر کا قیام، جیل خانوں کی تعمیر، سکوں کی ترویج وغیرہ۔ اس باب میں امام ابن قیم اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" میں ابن عقیل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

> سیاست کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ جس کے ذریعے عوام اصلاح سے قریب ہو جائیں اور فتنہ و فساد سے دور۔ اگرچہ اس معاملہ

سے متعلق نہ قرآن میں واضح حکم موجود ہو نہ حدیث میں۔ اگر کوئی شخص
یہ کہے کہ سیاست وہی ہے جس کی شرع نے وضاحت کردی ہے، یہ بات
بالکل غلط ہے۔ خود صحابہ کرام رضؓ نے اس کی تغلیط کی ہے۔ سچ پوچھو
تو اجتہاد رائے کا یہ سلسلہ عہد خلفائے راشدین سے چلا آرہا ہے۔
حضرت علی رضؓ نے جو زنادقہ کو جلایا۔ حضرت عثمان رضؓ نے قرآن کے جو غیر
معمول بہ مصاحف کو جلایا[1]۔ حضرت عمر رضؓ نے جو نصر بن حجاج کو جلا وطن
کیا۔ یہ سب اگر اجتہاد رائے نہیں تھا تو اور کیا تھا۔؟

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خود نبی اکرم نے جن جزئیات کو متعین فرمایا تھا ان کا
دائمی طور پر ناقابل تغیر و تبدل رکھا جانا مقصود نہ تھا۔ نہ ہی تمام کی تمام شریعت ان ہی
جزئیات کے اندر محصور ہوچکی تھی۔ اسلامی حکومت اپنے اپنے زمانے کے اقتضاءات
کے پیش نظر ان میں تبدیلیاں بھی کر سکتی تھی اور اضافے بھی۔ ناقابل تغیر صرف
قرآن کے اصول اور اس کی متعین کردہ جزئیات تھیں (اور ہیں)

ایک خلیفہ کے فیصلے کیخلاف دوسرے خلیفہ کا فیصلہ

خلافت راشدہ میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ایک خلیفہ کے فیصلے
کے خلاف دوسرے خلیفہ نے فیصلہ دیا ہو۔ مثلاً

(۱) قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا
ہے لیکن اس حصہ کا تعین نہیں کیا۔ نبی اکرم ص نے اقرع بن حابس اور

---

[1] اس واقعہ کی صحت محل نظر ہے۔

عیینہ بن حصن کو (جو امرائے قبائل میں سے تھے) ایک بار تالیف قلوب کے لئے سو سو اونٹ عطا فرمائے۔ پھر خلیفہ اول کے عہد میں انہوں نے کچھ زمینیں طلب کیں تو انہیں وہ بھی دیدی گئیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس اراضی کو یہ کہہ کر واپس لے لیا کہ اللہ نے اسلام کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس لئے وہ زمینیں اب اُن کے حقداروں کو دی جائیں گی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک مطلقہ عورت نے اپنی عدت کے زمانے میں نکاح کر لیا (حالانکہ قرآن میں اس کی ممانعت آئی ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کے کوڑے لگوائے اور فیصلہ صادر فرمایا کہ جو عورت اپنی عدت کے زمانہ میں نکاح کرے اگر اس کے شوہر کی اس کے ساتھ مقاربت نہیں ہوئی، تو دونوں میں علیحدگی کرا دی جائے گی۔ لیکن بعد میں یہ شوہر اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مقاربت ہو چکی ہے تو اس علیحدگی کے بعد وہ اس سے نکاح نہیں کر سکے گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کے جزو ثانی سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ بعد اختتامِ عدت اس شوہر سے نکاح جائز ہو گا خواہ مقاربت ہوئی ہو یا نہ۔

(۳) حضرت عثمان نے فیصلہ کیا تھا کہ آزاد عورت، غلام کی بیوی ہو کر

صرف دو طلاقوں سے دائمی طور پر حرام ہو جائے گی۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ وہ تین طلاق سے کم میں حرام نہیں ہوگی۔

(۴) اگر کوئی مرد حالتِ مرض میں اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو حضرت عمر کے فیصلے کے مطابق اس عورت کو متوفی کے ترکہ سے اسی صورت میں حصہ ملے گا کہ اس کا خاوند عدت کے زمانہ میں فوت ہو جائے۔ اگر عدت کی مدت گذر جائے تو پھر متوفی کے ترکہ سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے فیصلہ دیا کہ اس باب میں حد مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بہر حال ترکہ کی مستحق ہوگی۔

(۵) جس حاملہ عورت کا شوہر مر جائے حضرت عمر نے اس کی عدت وضع حمل مقرر کی۔ لیکن حضرت علیؓ کا فیصلہ ہے کہ وضع حمل اور چار مہینے دس دن کی مدت میں جونسی مدت طویل ہوگی وہی اس کی عدت ہے۔

(۶) دادا کی موجودگی میں حضرت ابو بکرؓ بھائیوں کو وراثت نہیں دلواتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایسی حالت میں بھائیوں کو وراثت دلوائی۔

(۷) حضرت ابو بکرؓ لوگوں پر برابر مال تقسیم کراتے تھے اور کسی کو کسی دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ یہی رسول اللہ کے زمانے میں ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ترجیحی حقوق قائم کئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہؐ کے

خلاف جنگ کی ہے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو حضور کے ساتھ شریک جہاد ہوئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے پھر اس امتیاز کو مٹا دیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات کتب تاریخ و آثار میں مذکور ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک خلیفہ کی متعین کردہ جزئیات کو ناقابل تغیر و تبدل نہیں سمجھا جاتا تھا ایک خلیفہ کا فیصلہ اس کے اپنے زمانے کے لیے شریعت ہوتا تھا، اس کے بعد آنے والے کا فیصلہ اس کے زمانے والوں کے لیے شریعت۔

ازاں بعد خلفائے راشدین کے بعد خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ "دین اور دنیا" کی تفریق تھا۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ بادشاہوں نے (جو اپنا نام خلیفہ ہی رکھتے تھے) "امور دنیا" کی سرانجام دہی کا فریضہ اپنے ذمہ رکھا اور "امور دینی" فقہا کے سپرد ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی نظام کا وہ اصل الاصول جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بتدریج نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ شریعت کی جزئیات متعین کرنے کا فریضہ انفرادی نہیں بلکہ ملت کا اجتماعی منصب تھا جس کی تکمیل مجلس شوریٰ اور امیر ملت کے فیصلوں سے ہوتی تھی۔ اب نہ امیر ملت تھا نہ اس کی مجلس شوریٰ، اس لیے جزئیات کی تعیین کس طرح ہوتی؟ اب لوگ فقہا کے پاس اپنے اپنے امور و قضایا لاتے۔ وہ پہلے قرآن کی طرف نگاہ دوڑاتے۔ اگر اس کی متعین کردہ جزئیات سے بات طے ہو جاتی تو ہو المراد

ورنہ وہ عہد رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ کے فیصلوں میں تفحص کرتے ۔ اور اگر وہاں بھی مناسب حال کوئی فیصلہ نہ ملتا تو مجبوراً خاموش رہتے رہا جیسے کہ آگے لکھا گیا ہے خود اجتہاد کرتے) اس ضرورت کے ماتحت نبی اکرمؐ اور عہد صحابہؓ کے احوال وکوائف اور اقوال واعمال کی جمع وتدوین کا خیال پیدا ہوا۔

ان ہی مجموعوں کا نام کتب روایات ہے ۔ چنانچہ ان میں سب سے

روایات پہلا مجموعہ جو آج ہمارے پاس ہے مؤطا امام مالکؒ ہے ۔ یہ مجموعہ قریب ۱۴۰ھ میں مدون ہوا ۔ اس میں کم وبیش پانچ سو روایات ہوں گی جو بیشتر احکام ہی پر مشتمل ہیں ۔ بنی عباس کے عہد حکومت میں ، سلطنت بہت وسیع ہو گئی اور تمدن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے نئے نئے مسائل پیش کر دیئے جن کا حل روایات عہد رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ میں نہیں مل سکتا تھا اور فقہا کے لئے یہ بھی مشکل تھا کہ ہر نئے معاملہ میں خاموشی اختیار کر لیں ۔ اس ضرورت کے ماتحت روایات وضع ہونی شروع ہوئیں اور سو سال کے عرصہ میں (یعنی مؤطا کے بعد جس میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم مدون ہوئی ہیں ۔ یعنی نبی اکرمؐ کے قریب اڑھائی سو سال بعد) ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ ایک امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے قریباً سات ہزار منتخب کر کے اپنا مجموعہ مرتب کیا ۔ اس ضرورت کے علاوہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وضع روایات کے لئے اور بھی بہت سے اسباب محرک ومؤید ہوئے لیکن یہ بحث میرے اس موضوع سے خارج ہے ۔ مجھے اس وقت

صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دینی لامرکزیت سے جب جزئیات شرعیہ کی تعیین کا دروازہ بند ہوا تو لوگوں کو کس طرح مجبوراً سابقہ متعین شدہ جزئیات پر اکتفا کرنا پڑا اور جب وہاں سے ہر مسئلہ کا جواب نہ ملا تو ان روایات میں کس طرح اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

فقہ لیکن ان کے ساتھ اہل فکر کا ایک اور گروہ بھی تھا جس نے ایسے مقامات پر خاموش رہنے یا وضعی حدیثوں کی طرف رجوع کرنے کی بجائے اس مشکل کا ایک اور حل سوچا۔ ان کے سامنے جب کوئی نیا سوال آتا تو وہ قرآن یا روایات کو سامنے رکھ کر قیاساً استنباط کرتے اور اس طرح اپنی فکر اور رائے سے مسئلہ پیش نظر کا حل متعین کر لیتے۔ گروہ اوّل اہل حدیث کے نام سے متعارف ہوا۔ اور گروہ ثانی اہل الرائے یا اہل فقہ کہلایا۔ مؤخر الذکر گروہ میں امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام ابویوسف، بغداد کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تو ان کی قابلیت و تفقہ سے ان کی فقہ دولت عباسی کا رسمی قانون بن گئی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس فقہ میں اور وسعت پیدا ہوتی گئی۔ یہی وہ فقہ ہے جو فقہ حنفی کے نام سے متعارف ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ، ملت کی مجلس شوریٰ اور ان کے منتخب کردہ امام کے تفقہ فی الدین کے اجتماعی فیصلے نہ تھے جو عہد اولیٰ میں شریعت کی جزئیات بنتے تھے۔ یہ ائمہ فقہ کے انفرادی تفقہ و تدبر کے نتائج تھے جنہیں حکومت اپنے مقاصد کے ماتحت بطور قانون رائج کر دیا کرتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قانون کے

محرکات، خاص مقاصد و مصالح ہوں تو اس کا اصول سے دور ہٹ جانا مستبعد نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مجموعۂ فقہ میں نہ معلوم کس کس گوشے کے فیصلے اور کون کون سے امیال و عواطف کے قضایا شامل ہوتے رہے۔ ملوکیت کا استبداد جو کچھ زندگی کے اور شعبوں میں کیا کرتا ہے وہی کچھ یہاں بھی ہوا۔ یعنی وضعی حدیثوں کی طرح فقہ کے مجموعۂ فتاویٰ میں بھی ایسی ایسی چیزیں شامل ہو گئیں جو کھلے طور پر قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔

اس طرح احادیث اور فقہ کے مجموعے مرتب ہوئے۔

دین مذہب سے بدل گیا

زوال بغداد کے بعد، ملت کی دنیاوی مرکزیت بھی ختم ہو گئی اور تشتت و افتراق کی اس عالمگیر افراتفری میں دین یکسر "مذہب" میں تبدیل ہو کر چند بے جان عقائد اور رسومات ظواہر کا نام رہ گیا[1]۔

(واضح رہے کہ دین، رفتہ رفتہ "مذہب" میں تو اسی زمانے سے بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی۔ زوالِ بغداد کے بعد اس سلسلہ کی تکمیل ہو گئی تھی)، علماء نے اپنی عظمت قائم رکھنے کے لئے مختلف مراکز قائم کر لئے

---

[1] میری تحریروں میں دین اور مذہب کے الگ الگ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ دین اس ضابطۂ زندگی کا نام ہے جسے قرآن نے متعین کیا اور مذہب ان عقائد و رسومات کا نام ہے جو ہم میں مروج ہیں۔

اور امت سے کہدیا گیا کہ وہ مذہب سے متعلق ہر معاملہ کے لیئے ان ہی مراکز عقیدت کی طرف رجوع کیا کریں۔ اس طرح مسلمانوں میں خالص برہمنیت PrieST HooD قائم ہو گئی جو ان کی زندگی کے ہر اس شعبہ پر جو مذہب سے متعلق تھا پورے طور پر چھا گئی۔ اگرچہ ان علماء میں باہمی اختلافات بیحد تھے اور مختلف فرقوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں مسلمان اصولی طور پر دو گروہوں میں منقسم تھے یعنی اہل حدیث اور اہل الرائے یا اہل فقہ۔ ان دونوں گروہوں کی باہمی چپقلش و آویزش، ملت اسلامیہ کی بدبختی کی ایک مستقل داستان ہے۔ گروہ سازی کا خاصہ ہے کہ انسان ان امتیازات میں جن سے اس کا فرقہ دوسرے فرقہ سے ممیز ہوتا ہے بڑا تشدد برتتا ہے کیونکہ اسی سے اس کا فرقہ قائم رہ سکتا ہے۔ اسی کا نام تعصب ہے۔ یہی تعصب اختلافات کو مستقل اور دائمی حیثیت دے کر ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کا موجب بن جاتا ہے۔ نیز جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کی زندگی کا ہر شعبہ انحطاط پذیر ہو جاتا ہے اور اس کا اثر خاص طور پر اس کی فکری صلاحیتوں پر پڑتا ہے۔ چونکہ قوم میں جدت افکار و قوت تخلیق باقی نہیں رہتی اس لیئے وہ تقلید جامد کو مسلک زندگی قرار دے لیتی ہے اور اس افلاس فکر و نظر اور فقدان تدبر و اجتہاد کو "اسلاف پرستی" کا مقدس نام دے کر خوش ہونے لگتی ہے۔ اسلاف پرستی کے لیئے ضروری ہے کہ گزرے ..... ہوئے زمانے کو اپنے زمانے سے مقدس

قرار دیا جائے اور اپنے ماضی کو درخشندہ اور حال اور مستقبل کو تاریک بنایا جائے۔ زوال بغداد کے بعد یہ تمام خرابیاں ابھر کر سطح پر آگئیں اور علماء نے امت کو یہ کہہ کر سلا دیا کہ

(۱) مذہب جو کچھ بننا تھا بن چکا، جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔ اب اس میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ۔

(۲) یہ مذہب علماء کو اسلاف سے وراثت میں ملا ہے اس لئے اسے علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(۳) تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم مذہب کے ہر معاملہ میں علماء کی طرف رجوع کرو اور ان کے فیصلوں کو خدا اور رسول کا فیصلہ سمجھو۔

(۴) چونکہ عقل کو مذہب میں کوئی دخل نہیں اس لئے اگر علماء کا کوئی حکم تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اس کے سمجھنے پر اصرار نہ کرو۔

(۵) بزرگوں کے راستے پر آنکھ بند کر کے چلتے جاؤ کہ یہی وہ صراط مستقیم ہے جو تمہیں سیدھا جنت کی طرف لیجائے گا۔

(۶) یاد رکھو تمہارا زمانہ فسق و فجور کا زمانہ ہے اس میں گنہگار بستے ہیں۔ تمہارے اسلاف کا زمانہ علم و تقویٰ کا زمانہ تھا اس لئے تم گنہگار اس کے اہل ہی نہیں کہ مذہب کے معاملات میں دخل دے سکو۔ اگر اسلاف کا کوئی فیصلہ قرآن کے خلاف نظر آئے تو اسے اپنی نظر کا قصور سمجھو کیونکہ اسلاف تم سے زیادہ قرآن فہم تھے۔

ان لوریوں سے انھوں نے قوم کو سلا دیا اور اس طرح ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی ساتید برہمنیت کی عظمت بٹھا دی واشربوا فی قلوبھم العجل

اب انہیں قوم کی طرف سے تو کسی حملہ کا اندیشہ نہیں رہا تھا مگر اپنے باہمی اختلافات کے باعث ایک دوسرے کی طرف سے ہراساں ضرور تھے اس کیلئے انھوں نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، عقائد میں شدت اور تعصب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کے متبعین ان عقائد میں ذرا سی لغزش یا تبدیلی کے خیال سے کانپ اٹھیں اور اس میں انہیں ایمان جاتا دکھائی دے۔ چنانچہ اہل فقہ کے مقابلہ میں احادیث کو عین اسلام بنانے کے لئے یہ عقائد وضع کئے گئے کہ

(۱) احادیث بھی دراصل منزل من اللہ ہیں اس لئے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی متلو (جس کی ہم قرآن میں تلاوت کرتے ہیں) اور دوسری غیر متلو جو احادیث میں ہے۔

(۲) جن باتوں کی صراحت قرآن میں نہیں ہے انہیں اللہ نے اس لئے مجمل چھوڑ دیا تھا کہ رسول اللہ اس اجمال کی تفصیل متعین کر دیں (اس طرح کتاب دین گویا دو مصنفوں کی مشترکہ تصنیف قرار پاگئی۔ چنانچہ امام اوزاعی کا قول ہے کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر کہ حدیثیں قرآن کی (دیکھئے مختصر جامع بیان العلم)

(۳) قرآن میں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے اس سے مراد

قرآن اور احادیث کی اطاعت ہے۔ لہذا احادیث قرآن کی مثل (مثلہ معہٗ) ہیں اور قرآن ہی کی طرح ابدی طور پر ناقابل تغیر و تبدل بلکہ حدیث قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

(۴) جب یہ اعتراض کیا گیا کہ احادیث میں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جو قرآن کے خلاف[2] ہیں تو یہ کہا گیا کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں یعنی اگر قرآن اور حدیث میں دو باتیں باہم متعارض ہوں تو حدیث کا حکم واجب التعمیل ہوگا۔ (ایضاً)

---

[1] مثلہ معہٗ کے متعلق طلوع اسلام میں ایک مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے۔

[2] مثلاً قرآن نے زنا کی سزا سو دُرّے مقرر کی ہے۔ لیکن احادیث میں شادی شدہ زانیوں کی سزا رجم (سنگسار) ہے جو قرآن پر خالص اضافہ ہے۔ یا قرآن نے ہر شخص کو یہ حق دیا ہے (بلکہ اللہ نے اسے فرض قرار دیا ہے) کہ وہ اپنے ترکہ کے لئے وصیت کرے۔ لیکن احادیث کہتی ہیں کہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی ورثاء کے لئے نہیں۔ یا قرآن دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ نہیں چاہتا۔ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ جو عقیدہ چاہے اختیار کرے لیکن احادیث کی رو سے مرتد کی سزا قتل ہے۔ یا قرآن نے جنگی قیدیوں کے متعلق حکم دیا ہے کہ انہیں فدیہ لیکر چھوڑ دو یا احساناً لیکن حدیث کی رو سے جنگی قیدیوں کو قتل کر دینے اور غلام اور لونڈیاں بنا لینے تک کا بھی حکم ہے۔ مسلمانوں میں غلامی آئی ہی روایات کے راستے سے ہے قرآن نے اس کے سب راستے بند کر دیئے تھے یہ احکام کی چند ایک مثالیں ہیں ورنہ جہاں تک دین کی روح کا تعلق ہے عجمی ٹکسالوں میں وضع شدہ روایات نے اسے یکسر مسخ کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل میرے دیگر مضامین میں ملے گی۔

ان کے مقابلہ میں اہل فقہ بھی اپنے عقائد میں کم متشدد نہ تھے۔ ان کے نزدیک اب امت کے لئے قرآن کا کوئی عملی فائدہ باقی نہ تھا اس میں سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ ائمہ فقہ نے حاصل کر کے اپنے مجموعۂ فتاویٰ میں جمع کر دیا۔ اب قرآن کی تلاوت فقط ثواب حاصل کرنے یا مردوں کو بخشنے کے لئے رہ گئی۔ جو جزئیات قرآن نے متعین نہیں کی تھیں، انہیں ائمہ فقہ نے متعین کر دیا اور اب ان کی متعین فرمودہ جزئیات قیامت تک کے لئے ناقابل تغیر و تبدل ہیں نہ ان میں حک و اضافہ ہو سکتا ہے نہ ادل بدل۔ اس لئے کہ اب مزید اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ حالانکہ خود ائمہ فقہ کا بھی یہ منشا نہ تھا کہ ان کے تفقہ کے استنباطات و اجتہادات کو ابدی طور پر ناقابل تغیر مان لیا جائے۔ ایک ہی نہج فکر کی فقہ کے مختلف ائمہ کے باہمی اختلافات اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے قیاس و آراء کو کبھی منزہ عن الخطا نہیں سمجھتے تھے۔ خود امام اعظمؒ اور اُن کے شاگردانِ جلیل امام محمدؒ اور امام ابو یوسف کے قیاسات و استنباطات میں اختلاف ہوتا تھا۔ علاوہ بریں اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ قرآن و سنت ہی سے اخذ مسائل کرتے ہیں لیکن ان کی فقہ میں ایسے ایسے فیصلے موجود ہیں جو قرآن کے بھی خلاف جاتے ہیں (اور اہل حدیث کے اعتراضات کی رو سے خود سنت رسول اللہ کے بھی خلاف) مثلاً فقہ کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کی وراثت میں سے کچھ نہیں ملتا اس کا جرم یہ ہے کہ اس کا باپ، اس کے دادا کی موجودگی میں کیوں مر گیا) حالانکہ یہ فیصلہ قرآن کے خلاف ہے۔ یا غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق تمام احکام، حالانکہ قرآن نے غلامی کو سرے سے مٹا دیا تھا اور صرف ان غلاموں اور

لونڈیوں کے متعلق احکام دیئے تھے جو نزول قرآن کے وقت پہلے سے موجود تھے۔ یا مثلاً وراثت کے قانون میں عول کا قاعدہ جس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اللہ تعالٰے کو (معاذ اللہ) حساب کے ابتدائی قواعد بھی معلوم نہ تھے۔

اب اگر ان سے کہا جائے کہ فقہ کے یہ فیصلے قرآن کے خلاف ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا امام اعظمؒ زیادہ سمجھتے تھے؟ اس جواب کے بعد وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے دین کے گرتے ہوئے ستون کو تھام لیا ہے۔

بہرحال اس طرح احادیث اور فقہ مستقل دین بن گئیں اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ناقابل تغیر و تبدل قرار پاکر، واجب العمل ٹھہر گئیں اور ان کی اطاعت کا نام ہوا اللہ اور رسول کی اطاعت۔ حالانکہ ان سے مفہوم صرف یہ تھا کہ رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر مختلف ادوار میں دین کو کس طرح سے سمجھا گیا اور شریعت کی جزئیات کی تعیین میں کیا کیا کوششیں ہوئیں۔ یعنی اگر جعلی روایات کو بھی الگ کر لیا جائے اور فقہ میں جو کچھ اِدھر اُدھر سے شامل ہو گیا ہے اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو بھی اُن سے صرف یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کے فلاں فلاں اصول کے متعلق فلاں فلاں زمانے میں کس قسم کی جزئیات متعین ہوئی تھیں، نہ رسول اللہ کا منشا تھا کہ یہ جزئیات ابدی طور پر ناقابل تغیر رہیں اور نہ ہی فقہاء کا مقصود تھا کہ ان کی جزئیات قیامت تک کے لئے دین بن جائیں۔ یہ خیال ہی بعد کی پیداوار ہے۔

معاشرتی جزئیات بھی دین بن گئیں

روایات کو دین بنا لینے سے ایک اور خرابی بھی ہوئی۔ نبی اکرمؐ عرب میں پیدا ہوئے اس لئے جس طرح آپ کی زبان عربی تھی اسی طرح آپ کی عام معاشرت وطریق بود وماند بھی وہی تھا جو اس زمانے کے عربوں کا تھا۔ اس معاشرت کی ایسی خرابیوں کی اصلاح کر دی گئی جو اسلام کے خلاف جاتی تھیں لیکن اس کے بعد حضورؐ کے رہن سہن کا طریق تولامحالہ وہی تھا جو اس زمانہ کے عربوں میں مروّج تھا۔ وضع قطع، لباس کی تراش خراش، سامان نقل وحرکت، اسباب حرب وضرب۔ غرضیکہ روزمرہ کے رہنے سہنے کے طریقے اور برتنے کی چیزیں وغیرہ سب اسی انداز کی تھیں جن کا اس زمانے میں رواج تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں جب تک قانون کی کسی شق سے متصادم نہ ہوں، قانون کی حدود میں نہیں جکڑی جاتیں اور ہر زمانے کے معاشرتی انداز کے مطابق اختیار کی جا سکتی ہیں۔ آپ کے کوٹ کی لمبائی کتنی ہونی چاہیئے۔ آپ کو جوتا کس قسم کا پہننا چاہیئے۔ پانی کس قسم کے برتن میں پینا چاہیئے (گلاس میں یا پیالہ میں) وقس علیٰ ہذا۔ یہ چیزیں دین میں داخل نہیں ہیں۔ لیکن جب روایات مرتب ہوئیں تو چونکہ وہ تاریخ تھیں عہد رسالتمآبؐ وصحابہ کرامؓ کی، اس لئے اس قسم کے عام معمولات کی باتیں بھی ان میں آ گئیں اور جب بعد میں روایات دین بن گئیں تو یہ چیزیں بھی جزو دین قرار پا کر قیامت تک کے لئے ناقابل تغیر سمجھ لی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف معاملات کی دنیا میں قانونی جزئیات میں ردوبدل کرنے کا اختیار

ملت سے سلب کر لیا گیا بلکہ روزمرہ کے معمولات میں بھی انھیں ایک خاص وضع
کی معاشرت کا پابند کر دیا گیا۔ پاجامہ کتنا لمبا ہونا چاہیئے، بالوں کی مانگ کس طرح
نکالنی چاہیئے۔ مسواک کی لمبائی کتنی ضروری ہے، غسل کے لئے کتنے لوٹے
پانی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ دین جسے زمانہ کے تقاضوں کا حل تجویز
کرنا چاہیئے تھا ظواہر پرستیوں Ritualism کا ایسا سخت مجموعہ بن گیا
جس میں کہیں لوچ اور لچک نام کو نہیں۔ اگر کسی مولوی صاحب کو معلوم
ہو جائے کہ میت کے غسل کے پانی میں بیری کے پتے نہیں ڈالے گئے تو وہ جنازہ
پڑھانے سے انکار کر دیں گے۔ یہودیوں کے تالمود کو اٹھایئے ہندوؤں کے
شاستروں کو دیکھئے۔ ایک ایک رسم کی ادائیگی میں کتنی کتنی جاں کاہ پابندیاں
لگائی گئی ہیں ان کے ہاں مذہب کی کوئی رادھا ناچ نہیں سکتی جب تک نومن تیل
نہ ہو۔ قرآن نے حضور کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) کہ وہ رسول کافۃ للناس انسانوں کو اس
بوجھ سے آزاد کر دے گا۔ جس کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے اور ان اطواق و سلاسل کو
اتار کر پھینک دے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ یہ اطواق و سلاسل، ملوکیت
کا استبداد اور برہمنیت کی رسوم پرستیاں تھیں۔ حضور
نے ان اطواق و سلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا لیکن مسلمانوں نے
ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور

اپنے احبار و رہبان کے مقدس ہاتھوں پھر اپنی گردنوں میں ڈال لیا اور ان قیود کا نام دین قرار دے لیا۔ یہ "دین" بھلا زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ کس طرح دے سکتا تھا؟ لہذا جو مسلمان ان قیود سے تنگ آئے انہوں نے ان اطواق و سلاسل کو اس زور سے اتار کر پھینکا کہ ان کے ساتھ ہی حبل اللہ (اللہ کی رسی۔ قرآن) کا قلادہ بھی ان کی گردنوں سے نکل گیا۔ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے جو قفس کی تیلیوں میں بند ہیں تو اس طرح کہ انہیں آزادی کی فضا میں ایک سانس تک لینا نصیب نہیں اور جو آزاد ہیں تو ایسے کہ فضا کی پہنائیوں میں اڑ رہے ہیں لیکن کہیں آشیانہ میسر نہیں۔

قرآن کہیں نہیں

یوں وہ فروعات و جزئیات جنہیں ابدی طور پر ناقابل تغیر رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصود رسالت دین بن گئیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اس وقت تک چلا آرہا ہے۔ وہی فرقہ بندیاں وہی گروہ سازیاں، وہی عملی برہمنیت (Priesthood) اور وہی ان کی اسلاف پرستی، وہی تقلید جامد اور وہی اس کے افسردہ نتائج، آپ کسی معاملہ کے متعلق اہل حدیث حضرات سے پوچھئے وہ کہدیں گے کہ بخاری میں یوں آیا ہے مسلم کی روایت یہ ہے اور کسی اہل فقہ سے پوچھئے تو جواب ملے گا کہ المبسوط میں یہ لکھا ہے اور شامی میں یوں آیا ہے۔ عالمگیری کا یہ فتویٰ ہے۔ فلاں امام کا یہ قول ہے۔

کوئی یہ نہیں کہے گا کہ قرآن نے یہ حکم دیا ہے۔ اس لیئے کہ قرآن سب کے نزدیک ساقط العمل ہو چکا ہے اور اس لیئے مہجور و محجوب۔ اس اشخاص پرستی سے تنگ آکر آج سے کچھ عرصہ پہلے بعض لوگوں نے رجعت الی القرآن کی آواز بھی اٹھائی لیکن چونکہ یہ چیز ان کی نگاہوں سے بھی اوجھل تھی کہ قرآن نے جن جزئیات کو متعین نہیں کیا انہیں کس طرح سے متعین کیا جائے گا۔ اس لیئے وہ اس اعتراض سے گھبرا کر کہ اگر قرآن ہی دین کی تکمیل کے لیئے کافی ہے تو اس میں سے فلاں فلاں بات کی تفصیل نکال کر دکھاؤ، لگے قرآن سے ان جزئیات کو بھی متعین کرنے جن کے اس نے صرف اصول دیئے تھے۔ وہ اس کوشش ناکام و ناصواب میں ایسے الجھے کہ ٹھکانے کی بات کچھ بھی نہ کر سکے اور خود ایک فرقہ (اہل قرآن) بن کر رہ گئے۔

اسے پھر سن لیجیئے کہ

(۱) قرآن نے جن جزئیات کو خود متعین کر دیا ہے وہ قیامت کے لیئے ناقابل تغیر و تبدل ہیں (اور ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے)

(۲) باقی امور کے لیئے اس نے اصول مقرر کیئے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کی حکومت اسلامی (یاد رکھیئے افراد نہیں بلکہ حکومت۔ جو قرآنی اصول مشاورت کی رو سے قائم کی جائے) اپنے زمانے کے مقتضیات کے مطابق، عقل کی روشنی میں ان کی جزئیات خود متعین کرے گی۔ اور یہی جزئیات اس زمانے کے لیئے نظام شریعت قرار پائیں گی۔ ان جزئیات

کی تعیین ہیں، ہر زمانے کی قرآنی حکومت، ان کوششوں کو بھی سامنے رکھنے گی جو اس سے قبل مختلف ادوار کی اسلامی حکومتوں نے (اور مختلف افرادنے) اس باب میں کی ہیں۔ اس بنا پر مجموعۂ احادیث اور کتب فقہ سے بطور نظائر Precedents فائدہ اٹھایا جائے گا ان میں جو باتیں قرآنی اصولوں کے مطابق ہوں گی اور موجودہ زمانے کے تقاضے ان میں تغیر و تبدل کے متقاضی نہ ہوں گے وہ علی حالہ رکھ لی جائیں گی۔ یا ان میں مناسب تغیر و تبدل کر کے انہیں از سر نو رائج کیا جائیگا۔ باقی خود متعین کی جائیں گی۔

کشتری اور برہمن

مذہب کو ایک پرائیویٹ حیثیت دے کر اسے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے ہاتھوں میں سونپ دینے کا جو سلسلہ، دینی لامرکزیت اور ملت کا شیرازہ بگڑنے کے زمانے سے شروع ہوا تھا وہ آج تک جاری ہے خود اپنے زمانے میں دیکھئے۔ دنیا میں متعدد "اسلامی سلطنتیں موجود ہیں لیکن ہر جگہ دین اور دنیا کی ثنویت   کا نظم کارفرما ہے۔ حکومت بادشاہوں کے ہاتھ میں ہے اور مذہب علماء کے تسلّط میں، اور دونوں کا استبداد عوام کے اذہان و قلوب پر مسلط۔ چونکہ ارباب ملوکیت اور عمائد مذہب کے مفاد مشترک ہیں اس لئے ان دونوں میں اس قسم کی ملی بھگت ہے،

جس طرح کھشتری راجاؤں اور برہمنوں میں ہوتی تھی۔ راجہ، برہمنوں کی رکھشا (حفاظت) کرتے تھے اور برہمن، راجاؤں کو اشیرباد (سلامتی کی دعائیں) دیتے تھے اور دونوں مل کر عوام کو محکومیت کے آہنی پنجے میں جکڑے رکھتے تھے۔ یہی حالت ہمارے ہاں کی ملوکیت میں تھی۔ بادشاہ علماء کو قاضی اور مفتی بنا دیتے تھے اور علماء بادشاہوں کو ظل اللہ بنا کر خطبوں میں ان کے نام صلوٰۃ و سلام کے ساتھ لیتے تھے اور عوام بیچارے ان دونوں کے تغلب و استبداد کے نیچے کچلے جاتے تھے یہی سلسلہ اب تک جاری ہے۔ غضب خدا کا۔ آج دنیا میں شخصی حکومتیں کہیں باقی نہیں رہیں بجز مسلمانوں کی حکومتوں کے۔ جس طرح بردہ فروشی کہیں باقی نہیں بجز مکہ کی گلیوں کے۔ غور کیجئے یہی علما ایک طرف ہمیں بتلاتے ہیں کہ وہ جرم عظیم جس کی وجہ سے یزید مستحق لعنت سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ اس نے سلطنت کو انتخاب کے ذریعے حاصل نہیں کیا بلکہ باپ سے وراثتاً پایا تھا اور اس طرح خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا تھا۔ لیکن دوسری طرف حالت یہ ہے کہ بنی امیہ سے لیکر

لہ احادیث میں یزید کے متعلق بھی عجیب چیز ملتی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا بخشا ہوا ہے (مغفور لہم) اور طبری کا بیان ہے کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہے اس کے ایک دستے کا سپہ سالار خود یزید تھا۔

اے عقل چہ می گوئی؟ اے عشق چہ فرمائی؟

ملوکیت اور ملائیت

آج تک ان تمام بادشاہوں کی جنھوں نے سلطنت کو یزید ہی کی طرح زبردستی حاصل کیا تھا اور آج بھی جو اسی طرح تخت وتاج کے مالک بنے بیٹھے ہیں علماء کی طرف سے تائید و محافظت حاصل رہی ہے۔ (اور آج بھی ہے) بادشاہ ان کی پرورش کرتے تھے اور یہ بادشاہوں کے تخت وتاج کی حفاظت کرتے تھے اور آج تک یہی سلسلہ جاری ہے۔ قرآن کا نظام نہ وہ نافذ کرنا چاہتے ہیں نہ یہ۔ اس لئے کہ اس نظام میں نہ ملوکیت باقی رہ سکتی ہے نہ ملائیت (Ppissthood) قرآن ان دونوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطے کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ اطاعت صرف ایک خدا کے قانون کی اور بس۔ اور اس کا ذریعہ، ملت کے منتخب کردہ بہترین افراد پر مشتمل مجلس شوریٰ اور ان میں کا منتخب کردہ بہترین فرد (امام) جو قرآن کے قانون کو دنیا میں نافذ کر دے۔ یہ نظام جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، ان حکومتوں میں نافذ نہیں ہو سکتا جن پر اس وقت مسلمان بادشاہوں کا تسلط ہے اور جن کی محافظت مسلمانوں کے اولادوفتادیٰ سے ہو رہی ہے۔ اس نظام کے نفاذ کی ابتدا اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہ سرزمین پاکستان ہی ہے اس لئے کہ اس پر ابھی تخذی ملوکیت کا تغلب نہیں ہوا۔ اس میں جس انداز کی حکومت ہم چاہیں رائج کر سکتے ہیں۔ لہذا پاکستان کا خطۂ ارض ایک تجربہ گاہ ہے جس میں قرآن کا وہی نظام جو سب سے پہلے محمد رسول اللہ والذین معہٗ (علیہم التحیۃ والسلام) کے مقدس ہاتھوں سے

سرزمین حجاز میں نافذ ہوا تھا بارِ دگر رائج ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہاں دستور سازی کا کام ان لوگوں کے سپرد ہو گیا (یعنی ہمارے علما حضرات کے، جو ان جزئیات کو ناقابل تغیر و تبدل سمجھتے ہیں جو ہزار برس پہلے، اس زمانے کی تمدنی ضروریات کے پیش نظر وضع کی گئی تھیں تو یہاں بھی دو صورتوں میں سے ایک صورت ناگزیر ہو گی یعنی

(۱) جو نظام یہ حضرات پیش کریں گے وہ ناممکن العمل بھی ہو گا اور مجبد متنازعہ[ؔ] فیہ بھی، اس لئے قوم سرے سے دینی نظام ہی سے اظہار براءت کر دیگی اور ترکوں کی طرح حکومت کی بنیاد خالص دنیاوی قوانین پر رکھ لے گی

اور یا

(۲) وہ پارٹی جس کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار حکومت ہو گی، علماء سے مصالحت کر کے مذہب اُن کے سپرد کر دے گی اور ان کی عباؤں اور قباؤں کے سائے میں اپنی من مانی حکومت چلائے گی اس طرح علماء کی سیادت بھی قائم رہے گی اور ارباب قوت کی قیادت بھی۔ لیکن دین کا قیام نہ اس

ؔ متنازعہ فیہ کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ علماء کا تمام گروہ اس ہزار برس میں اتنی سی بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ کھلے چھوڑنے چاہئیں یا باندھنے اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس جگہ۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ کوئی متفقہ علیہ ضابطہ آئین تیار کر دیں گے اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ پورا نظام تو ایک طرف یہ تو کسی ایک مسئلہ کا بھی متفق علیہ جواب نہیں دے سکتے۔ شیعہ کا جواب اور، سنی کا اور، مقلد کا اور غیر مقلد کا اور، ان کے ہاتھ میں نظام شریعت کی تدوین کا کام دے کر قوم مصیبت میں پھنس جائے گی۔

صورت میں ہو سکے گا نہ اس صورت میں۔

اب آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ میں نے جب یہ بحث چھیڑی تھی کہ فقہ یا روایات قیامت تک کے لئے ابدی دین نہیں بن سکتیں تو وہ محض نظری مباحثہ نہ تھا بلکہ ایک خالص عملی نتیجہ کی طرف دعوت دینے کی تحریک تھی۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ارباب فکر و نظر سوچیں کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ جو غلط نظام، دین کے نام سے، مسلمانوں پر اتنی صدیوں سے مسلط چلا آرہا ہے اور جس نے ان کی حالت یہ کر دی ہے کہ

بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

قرآنی نظام

وہی نظام اب آزاد پاکستان میں ان پر مسلط کر دیا جائے۔ یا وہ چاہتے ہیں کہ جب اللہ نے انہیں یہ آزاد خطۂ زمین موہبت فرمایا ہے تو اس میں پھر سے اس قرآنی نظام کو رائج کیا جائے جسے چشم فلک نے ایک مرتبہ دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک سرگرداں ہے۔ اس نظام قرآنی کی تشکیل و ترویج کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کی تعلیم بڑی واضح، بین اور تضاد و تعارض سے پاک ہے۔ وہ عقل انسانی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور ہر زمانے کے انسانوں کو آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ اس کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں فہم و تدبر سے کام لے کر اپنے لئے آپ قانونی جزئیات مرتب کریں۔ اس سے زیادہ آسان اور عقل انسانی کے عین مطابق اور کونسا نظام ہوگا۔

نہ جس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری   نہ جس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں

حقائقِ ابدی پر مدار ہے جس کا — وہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

طلوع ہے صفتِ آفتاب جس کا غروب — یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال

عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

مخالفت میں جانتا ہوں کہ اس دعوت کی مخالفت ہوگی۔ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی ایسی بات ہے جو دین کے خلاف ہے بلکہ اس لئے کہ اس سے ہمارے "اربابِ شریعت" کو اپنی عظمت و عقیدت کی مسندیں چھن جانے کا خوف ہے۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو نظامِ شرعی کی تنفیذ و ترویج کا مطالبہ ہی اس لئے کر رہے ہیں کہ اختیار و اقتدار ان کے ہاتھ میں رہے۔ لیکن وہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے اس دعوت کی مخالفت یہ کہہ کر کریں گے کہ دیکھئے! یہ ایسا نظام وضع کرنا چاہتے ہیں جس میں رسول اللہؐ کی حدیثوں ہی سے انکار ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس نظام میں حدیثوں سے انکار نہیں بلکہ انہیں ان کے اس مقام پر رکھنا ہے جو مقام خود منشائے رسالت تھا۔ رسول اللہ کا یہ منشا کبھی نہ تھا کہ حضور کے ہنگامی اور وقتی فیصلے قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر سمجھ لئے جائیں۔ اگر حضورؐ کا یہ

لہ یہ مضمون جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس قرآنی تصورِ حکومت کی جس قدر مخالفت مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

روایات

نشا ہوتا تو جس طرح آپ قرآن کو لکھوا کر بحفاظت ملت کے سپرد کر گئے تھے اسی طرح اپنی متعین فرمودہ جزئیات کا مجموعہ بھی لکھوا کر بحفاظت ملت کو دے جاتے۔ لیکن رسول اللہ ؐ اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو دے کر نہیں گئے۔ ان روایات کو لوگوں نے اپنے طور پر جمع کیا اور وہ بھی حضورؐ کی وفات کے سینکڑوں برس بعد۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس موجود ہیں ان میں سے کسی حدیث کے متعلق بھی کوئی شخص قطعی اور حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فی الواقعہ رسول اللہ ہی کا ارشاد ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، احادیث کا صحیح ترین مجموعہ بخاری کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ احادیث امام بخاریؒ نے رسول اللہ سے دو اڑھائی سو سال بعد، لوگوں کی زبانی سُن کر جمع کیں۔ اڑھائی سو سال کے عرصہ میں سُنی سُنائی باتیں جس قدر قابل اعتماد رہ سکتی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حالانکہ صورت یہ تھی کہ حضورؐ کے بہت بعد نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے سامنے ایسی احادیث آجاتی تھیں جنہیں وہ دیکھتے تھے کہ قرآن کے خلاف ہیں اس لئے وہ انہیں رد کر دیتے تھے۔ مثلاً فاطمہ بنت قیس کی روایت کہ طلاق بائنہ پائی ہوئی عورت کے لئے شوہر کے ذمہ نہ مکان ہے نہ نفقہ۔ جب حضرت عمرؓ کے سامنے آئی تو آپ نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ قرآن کے خلاف ایک عورت کی بات کیسے مان لی جائے۔ حضرت ابن عمرؓ نے جب بدر والی حدیث بیان کی کہ مردے سنتے ہیں تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ ابن عمرؓ پر رحم کرے۔

قرآن میں صاف لکھا ہے کہ مردے نہیں سُن سکتے۔ اسی طرح جب حضرت عائشہ کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مردہ پر اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے انہوں نے کہا کہ یہ حدیث غلط ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ ایک کا گناہ دوسرا نہیں اُٹھائے گا۔ سو جب خود صحابہؓ کے زمانے میں اس قسم کی احادیث مروج ہو گئی تھیں تو اڑھائی سو سال کے عرصہ میں ان کی جو کیفیت ہو گئی ہو گی وہ ظاہر ہے۔ بالخصوص جب اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جائے کہ نادانستہ نہیں بلکہ خاص مقاصد کے ماتحت

وضعی احادیث

جھوٹی حدیثیں اس کثرت سے وضع کی جایا کرتی تھیں کہ پناہ بخدا۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ عبد الکریم ابن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرام اور حلال کے احکام ہیں، وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس قسم کے ہزاروں واضعین احادیث اس عرصہ میں پیدا ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے صحیح ترین مجموعوں میں بھی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن پر دین ہنستا ہے اور عقل روتی ہے۔ کہیں ان میں ہے جب حضرت موسیٰ کے پاس ملک الموت آیا تو آپ نے اس کے ایسا تھپڑ مارا جس سے اس کی آنکھ باہر نکل پڑی۔ یا حضرت موسیٰؑ اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھ کر نہا رہے تھے کہ پتھر کپڑے لیکر بھاگ اٹھا اور آپ اس کے پیچھے ننگے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یا یہ کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک رات میں نوّے بیویوں سے مقاربت کی۔ یا یہ کہ حضرت

ابراہیم نے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ اور کہیں اس قسم کی احادیث کہ جس سے خود شان نبوت پر ہی طعن آجائے۔ مثلاً یہ کہ آپ پر کسی نے جادو کر دیا تھا جس سے آپ کو نسیان ہو گیا تھا۔ یا حضورؐ نے پیٹ کی بیماری میں اونٹوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا اور قتل کے جرم میں ہاتھ پاؤں کاٹ کر آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا اور وہ پیاس سے تڑپ رہے تھے لیکن انہیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ یا اس قسم کے اساطیر کہن (Nythology) کی باتیں کہ حضرت آدم کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ جبرئیل و میکائیل جنگ بدر میں سفید کپڑے پہنے ہوئے حضورؐ کی طرف سے لڑتے تھے۔ شیطان، حضرت ابو ہریرہؓ کی محافظت میں رکھے ہوئے مال کو چرانے آتا تھا اور آپ اس کی بہانہ سازیوں پر یقین کر کے چھوڑ دیتے تھے۔ رسول اللہ کے زمانے میں بیل اور بھیڑیا انسانوں کی طرح باتیں کیا کرتے تھے۔ مرغ جب بولتا ہے تو فرشتے کو دیکھتا ہے اور گدھا بولتا ہے تو شیطان کو دیکھتا ہے۔ یا حضرت ابن عمرؓ کے پاس ریشم کا ایک ٹکڑہ تھا، آپ جہاں جنت میں پہنچنے کا ارادہ کرتے وہ اُڑا کر پہنچا دیا کرتا تھا۔ یا رسول اللہؐ کو ایک درخت نے بتایا کہ جنات آپ سے قرآن سن کر گئے ہیں۔ یہ سب حدیثیں بخاری شریف میں موجود ہیں اور یہ تو یونہی چند مثالیں ہیں۔ حدیثوں کے تمام مجموعے اس قسم کی حدیثوں سے بھرے پڑے ہیں۔ حدیثوں کے اس قدر ظنی ہونے کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ ان احادیث کو بھی مسترد کر دیا کرتے تھے جو قیاس صحیح کے خلاف ہوں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے

کہ حضورؐ جب سفر میں جاتے تو قرعہ ڈالتے اور ازواج مطہرات میں جس کے نام قرعہ نکلتا انہیں ساتھ لے جاتے۔ امام اعظمؒ نے یہ کہہ کر اس سے انکار کر دیا کہ قرعہ اندازی تو اصولاً قمار بازی ہے، اس لئے اس حدیث کو کیسے مان لیا جائے۔ یا مثلاً جب کسی نے کہا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک بائع اور مشتری جدا نہ ہوں انہیں بیع کے فسخ کرنے کا حق رہتا ہے۔ امام اعظمؒ نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اگر یہ دونوں ایک ہی قید خانہ میں ہوں یا ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے ہوں تو اس صورت میں بیع پختہ ہی نہیں ہو سکے گی۔ وقس علی ہذا

میں نے ان مثالوں کو اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ نظام اسلامی کی تدوین کے لئے جس مسلک کی طرف میں نے دعوت دی ہے اس میں احادیث کو اُن کے اصلی مقام پر رکھا جائے گا۔ اس لئے اس باب میں غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر راہ حق و صداقت کو چھوڑ نہیں دینا چاہیئے۔

پس چہ باید کرد

ان تصریحات کے پیش نظر کرنے کا کام یہ ہے کہ مجلس دستور ساز ملت کے منتخب ارباب فکر و نظر کی ایک ایسی کمیٹی متعین کرے جس میں ماہرین قوانین دو سات تیر عالم اور وہ حضرات شامل ہوں جو قرآن و تاریخ دین پر غائر نگاہ رکھتے ہوں۔ ماہرین قوانین یہ تجویز کریں کہ پاکستان کی حکومت کے لئے کون کون سی شقوں پر مشتمل ضابطہ قانون کی ضرورت ہے۔ پھر

قرآن اور تاریخ دین جاننے والے حضرات اس خاکہ کو سامنے رکھ کر غور کریں۔

(۱) ان میں کون کون سی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق قرآن نے

فروعات و جزئیات تک متعین کردی ہیں - اور

(۲) کون کون سی ایسی ہیں جن سے متعلق صرف اصولی حکم دیا ہے۔

شق ثانی کے متعلق وہ غور کریں کہ اس قسم کے مسائل اس سے پیشتر نبی اکرمؐ کے زمانہ سے لیکر بعد تک کبھی سامنے آئے ہیں اور اگر آئے ہیں تو ان کے متعلق کیا روش اختیار کی گئی۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ کیا وہ روش آج بھی نافذالعمل ہوسکتی ہے یا موجودہ زمانے کے مقتضیات اس میں تغیر و تبدل چاہتے ہیں اگر اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ ہو تو اسے علی حالہ رہنے دیا جائے ورنہ اس میں حسب اقتضایاتِ زمانہ مناسب ردوبدل کر دیا جائے۔ اس ردو بدل میں یہ اصل ہر وقت پیش نظر رہے کہ کوئی فرع، قرآن کی اصل سے متعارض نہ ہو۔ یہ مجموعۂ قوانین، ملت اسلامیہ پاکستانیہ کا ضابطہ نظامِ شریعت ہوگا اور اس میں مزید ضروریات کے ماتحت مناسب حال تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ فریضہ تمام ملت کا مشترکہ ہے، جسے ملت اپنے منتخب کردہ حضرات کے سپرد کرے گی، اس میں کسی خاص جماعت کی اجارہ داری نہیں ہوگی۔ قوانین شریعت یا ان کی تعبیر و تفسیر، افراد کے ذمے نہیں رکھی جائے گی اس لئے "پرائیویٹ علماء" کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اصول جمہوری کے ماتحت قوانین کی ترتیب و تدوین بھی ملت کا مشترکہ فریضہ ہوگا اور ان کی تنفیذ و ترویج یا تعبیر و تفسیر......

(Interpretation) بھی ملت کی قائم کردہ حکومت ہی کے ذمے ہوگا۔ وہیں کا فیصلہ فتویٰ کہلائے گا۔

مجھے تسلیم ہے کہ یہ تجربہ چونکہ ایک مدت کے بعد دہرایا جائے گا اس لئے شروع شروع میں جو قانون بنے گا اس میں شاید خامیاں رہ جائیں۔ لیکن ان خامیوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ہمارا یہ قدم صحیح راستے پر ہوگا اور آہستہ آہستہ تجربہ کے بعد یہ خامیاں بھی رفع ہوتی جائیں گی۔ اس کے بعد ایک دن ہم ساری دنیا کو یہ کہنے کے قابل ہو جائیں گے کہ یہ ہے وہ نظامِ زندگی جسے خالقِ کائنات نے انسانیت کی نشو و نما کے لئے متعین فرمایا تھا اور جو ارتقائے شرف انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ وہ دن ہوگا "جب زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی واشرقت الارض بنور ربہا اور ہر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے۔ میں نے اس مضمون میں "اسلامی نظام" کی افادیت، ہمہ گیریت، فوقیت اور افضلیت سے بحث نہیں کی۔ اس لئے کہ یہ پہلو موضوعِ پیش نظر سے خارج ہے۔ اس وقت مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ اسلامی نظامِ شریعت سے مفہوم کیا ہے اور اس کی ترتیب و تشکیل کس طرح عمل میں آئے گی۔

باقی رہا یہ کہ یہ نظام کیا نتائج پیدا کرے گا اور نہ نتائج کس طرح مترتب ہوں گے یہ ایک جداگانہ بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ایک نکتہ واضح طور پر ہمارے سامنے آگیا ہے اور وہ یہ کہ اس نظام میں کس طرح

عقلِ انسانی کا مقام

انسانی عقل کو اس کا صحیح مقام عطا کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف ایک جہت سے ہی دیکھا جائے تو بھی اسلامی نظام کی عظمت نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔ جب سے شعور انسانی نے آنکھ کھولی ہے "مذہب اور عقل کی کشمکش" ہمیشہ اس کے سامنے رہی ہے۔ دنیائے مذہب نے ہر بار یہی پکارا کہ اس میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی حدیں ماورائے سرحدِ ادراک سے شروع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عقل کو ہمیشہ یہی دعویٰ رہا کہ انسانی زندگی کے فیصلوں کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ وہ اپنے اس حق میں کسی اور کی شرکت گوارا نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں قرآن ایک ایسا سنگِ میل ہے جہاں سے فی الواقعہ ایک نئے انداز زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے عقل اور مذہب کے صحیح حدود متعین کر کے ان میں اس قسم کی یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کی ہے کہ وہ دو متضاد و متخاصم عناصر ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے معاون و رفیق بن گئے ہیں۔ قرآن کے اوراق کو الٹتے جائیے شروع سے اخیر تک آپ دیکھیں گے کہ وہ عقل و بصیرت، فہم و فراست، علم

ؔ یہ تمام امور میرے دوسرے مضامین میں مل جائیں گے۔

و دانش، تدبر و فکر کو کس طرح وجہ شرف و تکریم قرار دیتا ہے۔ وہ مخاطب ہی عقل کو کرتا ہے۔
اس کے نزدیک صاحبانِ دانش و بینش اولی الابصار و اولی الالباب ہی وہ لوگ ہیں
جو اس کے پیغام کو سمجھنے اور اسے بروئے کار لانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس
وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو "بدترین خلائق" قرار دیتا ہے ان شر الدواب
عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون (۸/۲۲) (یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین
خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل سے کچھ کام نہیں لیتے)
اس کے نزدیک ایسے انسان اس قابل ہی نہیں کہ انہیں انسانوں کے زمرہ میں
شامل کیا جائے۔

ولقد ذرأنا لجھنم کثیرًا من الجن والانس لھم قلوب
لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان
لا یسمعون بھا۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل ط
اولئک ھم الغافلون ٥ (۷/۱۷۹)

کتنے ہی جنّ[1] و انس ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے (یعنی ان کے
اعمال کے بدلے ان کا ٹھکانہ جہنم ہونے والا ہے) یہ وہ لوگ ہیں جن کے
پاس قلب و دماغ ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے آنکھیں
ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام

[1] جن سے کیا مراد ہے۔ اس کی تفصیل معارف القرآن کی جلد دوم میں ملے گی۔

نہیں لیتے۔ وہ عقل ودانش کو الگ رکھ کر حیوانوں کی طرح ہو گئے۔ بلکہ
ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے، یہ وہ لوگ ہیں جو ادنیا د مافیہا سے)
بے خبر زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ چونکہ عقل کا فطری منصب تحفظ ذات Preservation of Self ہے۔ یعنی اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اُس فرد کی طبیعی زندگی کو محفوظ رکھے جس کی وہ پاسبان ہے۔ اس لئے جس وقت مختلف افراد کے مفاد آپس میں ٹکرائیں گے۔ (اور ایسا تصادم، اجتماعی زندگی میں قدم قدم پر ہوتا ہے) اس وقت ان افراد کی عقول کی باہمی جنگ لازمی ہے۔ ہی کو Battle of Wits کہتے ہیں یعنی عقل انسانی صرف افراد کے حقوق کا تحفظ چاہتی ہے۔ انسانیت کے مفاد کلی کا تحفظ اس کے حیطہ فرائض سے باہر ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ افراد کی عقل کو ایسی حدود کے اندر رکھا جائے جس سے وہ انسانیت کے مفاد کلی کے لئے ضرر رساں نہ ہو سکے۔ ان ہی حدود کا نام وہ اصولی قوانین ہیں جو قرآن نے انسانی زندگی کی راہنمائی کے لئے متعین کئے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے عقل انسانی کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ تسخیر کائنات میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دے۔ یہ ہے "عقل اور مذہب میں تطبیق و موافقت جسے قرآن نے پیدا کیا ہے۔ اس کے نزدیک عقل آنکھ ہے اور قرآنی اصول، سورج کی روشنی۔ نہ آنکھ روشنی کے بغیر اپنا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے اور نہ روشنی آنکھ کے

بغیر کسی مصرف کی ہے۔ عقل کو الگ کر کے انسانوں کی دنیا پتھروں کا ڈھیر بن جائے گی لیکن عقل کو تنہا چھوڑ کر یہ دنیا درندوں کے بھٹ میں تبدیل ہو جائے گی۔ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے، قرآن کے نزدیک انسانی زندگی کی سطح سے بہت نیچے ہیں لیکن عقل سرکش اور علم بیباک کا نام اس کی زبان میں ابلیسیت، اور شیطانیت ہے۔ جب عقل ان ابدی اصولوں کی رفاقت میں کام کرتی ہے جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے تو اس سے یہ دنیا اس جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کی تلاش میں آدم اتنے عرصہ سے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسلامی نظام عقل اور ابدی اصولوں میں یہی رفاقت و تعاون پیدا کرتا ہے۔ ملائیت Priesthood کی ذہن عقل کو سلب کرتی ہے اور ملوکیت کا استبداد، ان ابدی اصولوں کی جگہ انسان کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کراتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسانی زندگی کے خلاف اور احترام آدمیت کی نقیض ہیں۔ ان کے برعکس، اسلامی نظام حکومت عقل کو اجاگر کرتا ہے اور اسے اس نور مبین (کھلی کھلی روشنی) میں چلاتا ہے جو اس کی راہنمائی کے لئے قرآنی آفتاب کی کرنوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج بلکہ رفاقت سے شرف انسانیت بلند سے بلند تر ہوتا ہوا زمین کی پستیوں سے آسمان کی رفعتوں کی طرف ابھرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہیں اسلامی نظام کے صحیح نتائج۔

لیکن اس حقیقت کو بھی یاد رکھئے کہ کوئی نظام اپنے صحیح نتائج پیدا نہیں

[1] ان امور کی تفصیل بھی معارف القرآن کی دوسری جلد میں ملے گی۔

کرسکتا جب تک اسے چلانے والے اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرلیں۔ باہر کی دنیا کا انقلاب اندر کی دنیا کے انقلاب کا عکس ہوا کرتا ہے۔ قرآنی نظام میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ دل کی دنیا میں تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اور پھر یہی تبدیلیاں اس نظام کو Cyclic Order بطریق احسن چلائے جاتی ہیں۔ اس طرح ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جو خود اپنے زور دروں Momentum سے متحرک رہتا ہے۔ یہ تبدیلیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور اس نظام میں فرد اور جماعت کا کیا تعلق ہوتا ہے یہ چیزیں کسی دوسرے وقت عرض کروں گا۔[1] اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ جس اسلامی نظام کے لئے چاروں طرف سے پکار ہو رہی ہے وہ ہے کیا اور آج اسے مرتب کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے میں نے گذشتہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

بعض مقامات کی مزید وضاحت

اس مضمون کی اشاعت کے بعد میرے پاس بہت سے استفسارات موصول ہوئے میں نے اُن کے جواب "سلیم کے نام خط" میں دیئے تھے۔ مزید وضاحت

---

[1] اس ضمن میں "سلیم کے نام خطوط" کا سلسلہ دیکھئے جو الگ شائع ہو رہا ہے۔

کے خیال سے اس خط کو بھی ذیل میں درج کر دیا جاتا ہے۔

سلیم کے نام

تمہارا خط ملا۔ سچ پوچھو تو میں اس خط کا اُس دن سے انتظار کر رہا تھا، جس دن تمہیں طلوعِ اسلام کا وہ پرچہ بھیجا ہے جس میں "اسلامی نظام" سے متعلق میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس لئے تم نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے وہ غیر متوقع نہیں اور نہ ہی وہ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ جو ان شبہات کا محرک ہوا ہے۔ سلیم! تم ابھی نہیں جانتے کہ جو عقیدہ کسی قوم میں صدیوں سے متوارث چلا آ رہا ہو اور توارث اور ماحول کے موثرات سے انسانی تحت الشعور Sub-conseious Mind کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا ہو وہ کس طرح مبنی علی الحقیقت نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے اس قسم کے عقیدہ کی تائید میں دلائل و براہین بھی رکھتا ہو۔ لیکن یہ دلائل و براہین ذہن انسانی کے بعد کے تراشیدہ ہوتے ہیں۔ اس نے اس عقیدہ کو ان دلائل و براہین کی بنا پر اختیار نہیں کیا ہوتا۔ عقل کا منصب تحفظِ ذات (Preservation of Self) ہے اور شکستِ پندار، خواہ وہ علمی اور نظری میدان ہی میں کیوں نہ ہو، ضعفِ ذات کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے عقل، ہر اس عقیدہ کے لئے جو انسان نے غیر شعوری طور پر اختیار کر رکھا ہو دلائل و براہین وضع کرتی رہتی ہے تاکہ فریقِ مقابل سے شکست کھا کر انسان کی ذات میں احساسِ کمتری Inferiority Complex

نہ پیدا ہو جائے کہ احساسِ کمتری جذبۂ مرعوبیت کا موجب بنتا ہے اور جذبۂ مرعوبیت ضعفِ ذات کا سبب۔ اس لئے جب کبھی انسان کے سامنے کوئی ایسی بات آئے جس سے اس کے عقیدہ کی تغلیط ہوتی ہو تو عقل کی طرف سے پہلا ردعمل، اس نئے نظریئے یا اصول کی تردید ہوتا ہے۔ غیر شعوری طور پر اختیار کردہ عقائد کو منزہ عن الخطا سمجھ کر اُن کے گرد حصارِ عافیت کھینچنے کی کوشش کا نام تقلید اعمیٰ ہے جو صحیح علم و بصیرت کی بدترین دشمن اور ہر دعوتِ الی الحق اور حرکتِ انقلاب کی اولین مخالف ہوتی ہے آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے۔ ہر داعی الی اللہ کی دعوت حق و صداقت کے جواب میں یہی کہا گیا کہ جو عقائد ہمارے آباء اجداد سے متوارث چلے آرہے ہیں ہم انہیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ (وکذٰلک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃ و انا علیٰ اٰثارھم مقتدون (۴۳/۲۳) اسی طرح اے رسولِ عربی، ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر وہاں کے سہل انگار طبقہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباء اجداد کو ایک مسلک پر چلتے دیکھا ہے اور ہم ان ہی کے نقوش قدم پر چلتے ہیں)۔ لیکن سلیم! ذرا سوچو کہ کسی عقیدے کے صحیح ہونے کی یہ دلیل کس قدر خدا ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے۔ اگر تپِ دق کے جراثیم جو انسان کو اجداد سے وراثتاً ملے ہوں یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انہیں فنا کر دیا جائے، تو غلط معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ اُن کی

پرورش خونِ قلب وجگر سے کی جائے۔ حق وباطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحی مبین کی شکل میں ہماری رشد وہدایت کے لئے ہمیں عطا کی گئی ہے۔ لہذا میں نے جو کچھ کہا ہے اسے اس ازلی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو اور پھر نتیجہ پر پہنچو۔ یہ کہہ دینے سے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس عقیدہ کے خلاف ہے جو جمہور کو اسلاف سے ملا ہے نہ جمہور کے اس موروثی عقیدہ کو صحیح قرار دے سکتا ہے نہ میرے معروضات کا ابطال کر سکتا ہے۔ صحت سقم کا معیار میزانِ قرآنی ہے، نہ میرا دعویٰ نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی شخص میری گزارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اسے کہو کہ اس کے لئے قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

سلیم! بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔ بڑھانے کو جتنی جی چاہے بڑھائے جائیے لیکن سمجھنے کے لئے بالکل واضح اور سادہ۔

ہم عشق کے ماروں کا، اتنا سا فسانہ ہے

سمٹے تو میرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

تم تھوڑی دیر کے لئے یوں کرو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے بھی بھول جاؤ اور جو عقیدہ ہمیں وراثتاً ملا ہے اسے بھی الگ رکھ دو (ثم تتفکروا) پھر از خود غور کرو کہ قرآن ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں زنا کی سزا متعین ہے لیکن شراب کی سزا کا

کہیں ذکر نہیں۔ اب اس سے یا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن، شراب خوری کو جرم ہی قرار نہیں دیتا اس لئے اس کی سزا تجویز نہیں کی گئی لیکن یہ نتیجہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے اس لئے کہ

(۱) قرآن کی رو سے خمر (شراب) رجس من عمل الشیطان (۵/۹۰) ہے یعنی ناپاک فعل شیطانی۔

(۲) زنا کے متعلق اس کی ارشاد ہے کہ انہ کان فاحشۃ (۱۷/۳۲) وہ فحش کاری ہے۔ اور

(۳) شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے فانہ یامر بالفحشاء والمنکر (۲۴/۲۱)

اس لئے شراب بھی فواحش میں سے ہوئی۔ (کیونکہ شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے اور شراب (خمر) شیطانی عمل ہے) اس لئے جس طرح زنا فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم، اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ منشائے قرآنی یہ ہے کہ شراب (خمر) کی کوئی سزا نہ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شراب (خمر) کی سزا ضروری ہے تو قرآن نے اس کی سزا متعین کیوں نہیں کی جس طرح زنا کی سزا متعین کردی ہے۔

قرآن ناقص کتاب نہیں

ایک غیر مسلم معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) ناقص کتاب ہے وہ کسی جرم کی سزا متعین کر دیتا ہے کسی کو غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جن جرائم کی

تعزیر (یعنی اجمال کی تفصیل) قرآن نے متعین نہیں کی، ان کی تعیین رسول اللہ نے کر دی ہے اور اس طرح کتاب اللہ کی تکمیل ہوئی ہے اس کا نام سنت قرار دیا جاتا ہے[1] اور دین سے مفہوم ہوتا ہے قرآن اور سنت۔

لیکن ذرا سوچو سلیم! کیا اس سے اس اعتراض کا واقعی جواب مل جاتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے! اعتراض یہ تھا کہ کیا خدا خود ان چیزوں کی تعیین نہیں کر سکتا تھا جو انہیں اس طرح غیر متعین چھوڑ کر ان کی تکمیل دوسروں سے کرانی پڑی؟ اسے کونسا امر مانع تھا کہ جس طرح زنا کی سزا متعین کر دی تھی اسی طرح شراب (خمر) کی بھی تجویز کر دیتا۔ یا جس طرح روزوں کے مہینے اور اوقات کی تخصیص کر دی تھی زکوٰۃ کی شرح بھی مقرر کر دیتا۔ مقام رسالت کی اس عظمت و رفعت کے باوجود جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ — بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر — ذات خداوندی کے متعلق یہ اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ اس نے ان تفاصیل و جزئیات کی خود تکمیل کیوں نہیں کی؟ یہ اعتراض ایسا قوی تھا کہ اس کے لئے ایک آفاقی سہارا ڈھونڈھنا پڑا۔ یعنی یہ عقیدہ وضع کرنا پڑا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے مجموعہ کا نام قرآن ہے (اسے وحی متلو کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے)، اور دوسری وحی وہ جو قرآن سے باہر رسول اللہ کی روایات میں ہے (اسے وحی غیر متلو کہتے ہیں کیونکہ اس کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ اس عقیدہ سے اس اعتراض کا جواب یوں مل گیا کہ ان جزئیات کی تعیین بھی خود خدا ہی نے کر دی ہے۔ البتہ وہ

---

[1] چونکہ شراب کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تجویز نہیں فرمائی بلکہ بعد میں حضرت عمرؓ نے متعین کی ہے اس لئے سنت کا مفہوم اور بھی وسیع کر دیا جاتا ہے جس میں نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے کے اقوال و اعمال سب شامل کرلئے جاتے ہیں۔

اصل کتاب (قرآن) میں نہیں بلکہ روایات کے مجموعوں میں ہے۔ ذرا سوچو سلیم! کہ یہ دلیل (یا عقیدہ) کس طرح بداہتاً غلط اور درایتاً کمزور ہے۔ سب سے پہلے تو وحی کی اس تقسیم کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ وہاں تو واضح طور پر موجود ہے کہ وحی وہی ہے جو قرآن میں ہے اور جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ کہف میں ہے واتل مااوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلماتہ ولن تجد من دونہ ملتحدا۔ (۱۸/۲۷) تیرے رب کی کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے لفظوں کو بدل نہیں سکتا۔ (اور اگر تو بھی بفرضِ محال ایسا کرے تو) اس کے سوا تو کہیں پناہ نہ پائے گا۔" سارے قرآن میں اس کا اشارہ تک موجود نہیں کہ خارج از قرآن وحی کہیں اور بھی ہے یا وحی کی کوئی دوسری قسم بھی ہے۔ البتہ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں (متلو اور غیر متلو) اور وہیں سے یہ عقیدہ مسلمانوں نے مستعار لیا۔ (اس کی تفصیل تم نے معراج انسانیت کے باب ظہر الفساد میں دیکھ لی ہوگی)

پھر ذرا اسے بھی سوچو سلیم کہ وحی کی اس تقسیم سے بالآخر مقصود کیا تھا؟ وہی خدا (وحی کا بھیجنے والا)، وہی رسول (جس پر وحی بھیجی جاتی تھی)، وہی زبان (جس میں وحی نازل ہوتی تھی)۔ وہی مخاطب (جن کی ہدایت کے لئے وحی آتی تھی) دونوں وحیوں کی حیثیت بھی برابر (مثلاً عہ)، لیکن اس کے باوجود کچھ وحی قرآن میں اور کچھ وحی قرآن سے باہر یہ حکم کہ اتوالزکوٰۃ (زکوٰۃ دو) قرآن میں، اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بشرح

اڑھائی فی صدی دو، قرآن سے باہر۔ کیا قرآن میں "اڑھائی فی صدی" کے الفاظ نہیں لائے جا سکتے تھے؟ کیا اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ[1] تھا سوچو سلیم! اس تقسیم خداوندی میں کون سی مصلحت تھی! اس کی کیا ضرورت تھی کہ ایک قسم کی وحی سے حکم دیا کہ زکوٰۃ دو۔ اور اسے قرآن میں محفوظ کر دیا۔ اور دوسری قسم کی وحی سے بتایا کہ زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فی صدی ہے؟ اور اسے قرآن سے باہر رکھا! یہ تو ہوا عمل خداوندی کے متعلق عقیدہ کہ اس نے وحی کی اس طرح تقسیم کر دی! اب اس کے بعد عملِ رسالت دیکھئے کہ اس عقیدہ کی رو سے حضورؐ نے وحی کی ایک قسم (متلو) کے متعلق تو اتنی احتیاط برتی کہ اسے تمام و کمال لکھوا دیا۔

قرآن میں تفصیل کیوں نہ دیدی

شروع سے اخیر تک، اسی ترتیب کے مطابق جس میں یہ کتاب ہے۔ حفاظ کو زبانی یاد کرایا ان کے حفظ کردہ کو بار بار سن لیا۔ اور اس طرح یہ وحی قرآن کی دفتین میں محفوظ کر کے امت کو دیدی۔ باقی رہی وحی کی دوسری قسم، سو اسے نہ کہیں لکھوایا۔ نہ کسی کو یاد کرایا، نہ اس کا کوئی مجموعہ مرتب کیا، نہ اس کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا بلکہ ازخود تبرکاً کچھ لکھنا بھی چاہا تو اسے روک دیا کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن (مسلم) مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو"! ذرا غور کرو سلیم! کہ دین نام رکھا جاتا ہے قرآن (وحی متلو) اور سنت (وحی غیر متلو) کے مجموعے کا دین کے جزو اول کی حفاظت کا تو اس قدر

[1] سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس کے لئے یہی دلیل دی ہے کہ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔

انتظام واہتمام کیا جاتا ہے اور جزو ثانی کو اس طرح لاوارث چھوڑ دیا جاتا ہے! کیا اس سے رسول اللہ کے منصب رسالت (دین خداوندی کو انسانوں تک پہنچانے) پر (معاذ اللہ) حرف نہیں آتا؟ کہا جاتا ہے کہ عربوں کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ سب کچھ زبانی یاد کر لیا کرتے تھے اس لئے روایات کو لکھوانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس پر تو غور کرو کہ اگر عربوں کا حافظہ ایسا ہی قابل اعتماد تھا تو پھر قرآن کو کیوں لکھوایا گیا؟ اور پھر یہ بھی کہ جس طرح قرآن کو لفظاً لفظاً یاد کرایا گیا اور ان کے یاد کئے کی تصدیق کی گئی، اسی طرح روایات کو بھی کیوں نہ یاد کرا کر ان کی تصدیق کر دی گئی! "وحی غیر متلو" کی تدوین و تحفظ کے بارے میں عمل خداوندی اور عمل رسالت مآب تم دیکھ چکے۔ اب عمل خلفائے راشدین دیکھئے۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے قرآن کریم کے نسخے تیار کرائے اور ان مصدقہ نسخوں کو سلطنت کے مختلف گوشوں میں پہنچایا اور حکم دے دیا کہ جہاں کہیں کوئی اختلاف ہو، ان مصدقہ نسخوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ انہوں نے یہ انتظام دین کے ایک جزو (وحی متلو یعنی قرآن) کے متعلق کیا لیکن دین کے دوسرے جزو (وحی غیر متلو یعنی احادیث) کے متعلق کچھ نہیں کیا۔ نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہیں کیا بلکہ جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص انفرادی طور پر ان کی تحریر و روایت کی کوشش کر رہا ہے اسے اس سے روکا اور عند الضرورت اس پر سخت مواخذہ بھی کیا (تفصیل اس کی تم کئی بار سن چکے ہو[1]) ذرا سوچو سلیم! کہ یہ تمام تصریحات تمہیں کس نتیجہ پر

---

[1] ان تمام امور کی تفصیل میرے مضامین میں آ چکی ہے جو "مقام حدیث" کے نام سے الگ شائع ہو رہے ہیں۔

پہنچاتی ہیں؛ کیا تم لامحالہ اس نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ یہ عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ نہ یہ منشائے خداوندی تھا نہ منشائے رسالت ماٰبؐ نہ مسلک خلافت راشدہ۔ اس تمام عہد میں وحی کی ایک ہی قسم تسلیم کی جاتی تھی جو قرآن میں محفوظ تھی۔ یہی اللہ نے رسولؐ کو دیا، اسی کو رسول نے امت تک پہنچایا اور اسی کو صحابہؓ نے آگے بڑھایا۔

اسے ایک بار پھر سُن لو سلیم! کہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا۔ اگر احادیث دین کا جزو ہوتیں تو کیا رسول اللہؐ پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا تھا کہ وہ دین کے اس حصے کو بھی مستند طور پر مرتب کر کے اُمت کو دے کر جاتے؟ احادیث کے مجموعے، حضورؐ کی وفات کے بہت عرصہ بعد لوگوں نے انفرادی طور پر مرتب کئے تھے۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ رسول اللہؐ دین کے ایسے اہم حصے کو اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ کے نزدیک یہ حصہ دین کا جزو تھا ہی نہیں۔ جو لوگ اب احادیث کو دین سمجھ رہے ہیں اُن سے یہ سوال پوچھئے۔ ان میں سے کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔

احادیث کے جزو دین بننے کی خرابیاں

اب یہ دیکھو کہ اس غلط عقیدہ نے دین میں خرابیاں کس قدر پیدا کیں؟ قرآن اپنی محفوظ شکل میں امت کے پاس موجود تھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی تھی۔ اس لئے اس میں ایک حرف کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس

روایات کا کوئی مصدقہ مجموعہ امت کے پاس نہ تھا، لیکن انہیں اس عقیدہ کی رو سے قرآن کا ہم پلّہ قرار دیا گیا تھا۔ اب سوچئے کہ اس سے دین میں کس قدر تحریف والحاق کا دروازہ کھل گیا۔ جس کا جی چاہتا کوئی حکم اپنی طرف سے وضع کرتا اور اس کے ساتھ دو چار راویوں کے نام کا اضافہ کر کے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتا، اور یہ حکم دین کا جزو بن جاتا۔ کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اس کی پرکھ کر سکتا کہ یہ واقعی قولِ رسول ہے یا خود ساختہ روایت۔ معیار تھا تو یہ کہ جن دو چار راویوں کے نام بطور اسناد شامل کئے گئے ہیں، وہ روایات پرکھنے والوں کے معیارِ ثقاہت پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ غور کرو تسلیم! کہ جس دین، (قرآن) کو خدا اور اس کے رسول نے اتنی احتیاط اور حفاظت سے دیا تھا اس دین میں تحریف والحاق کے کتنے بڑے فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ قرآن میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے کہ آپ کو بھی اس کی مجال نہ تھی کہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکتے۔ قل ما یکون لی ان ابدلہٗ من تلقاءِ نفسی ان اتبع الا ما یوحیٰ الی (۱۰/۱۵)۔ "ان سے کہدو کہ میری کیا مجال ہے کہ میں قرآن میں اپنی طرف سے کچھ تغیر و تبدل کر دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے کہ ولو تقول علینا بعض الاقاویل۔ لاخذنا منہ بالیمین۔ ثم لقطعنا منہ الوتین (۶۹/۴۴-۴۶)۔ "اگر رسول کسی بات کو یوں ہی ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم دائیں ہاتھ سے

پکڑ کر اس کی رگ جان کاٹ ڈالتے"۔ لیکن اب واضعین حدیث کے لئے میدان صاف تھا کہ جو جی میں آئے وضع کریں اور اُسے رسول اللہ ؐ تک منسوب کر دیں۔ اور جب اُن سے کہا جائے کہ یہ تعلیم قرآن میں تبدیلی ہے یا اس پر اضافہ جس کے رسول اللہ مجاز نہ تھے تو اس کا کھلا ہوا جواب موجود تھا کہ یہ تبدیلی یا اضافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے نہیں کیا یہ تو وحی غیر متلو کے ذریعہ سے کیا تھا جو خدا ہی کی طرف سے تھا اس لئے یہ تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس "وحی غیر متلو[1]" نے نہ صرف ان جزئیات ہی کو ابدی طور پر متعین کر دیا جنہیں قرآن نے غیر متعین رکھا تھا بلکہ قرآن کی متعین کردہ جزئیات میں ترمیم و تنسیخ بھی کر دی۔ مثلاً قرآن نے زانی کی سزا سو دُرّے مقرر کی ہے۔ روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ سزا غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی ہے۔ شادی شدہ کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ یا قرآن نے کہا تھا کہ ہر شخص اپنے مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے لیکن روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی وارثین کے حق میں نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ یعنی پہلے تو صرف اتنا ہی اعتراض تھا کہ چونکہ قرآن نے ان احکام کی جزئیات خود متعین نہیں کیں اس لئے یہ کتاب (معاذ اللہ) ناقص ہے۔ لیکن اب وحی غیر متلو

---

[1] "وحی غیر متلو" کی عجمی سازش کے متعلق طلوع اسلام میں مفصل مضمون (مئی ۱۹۵۰ء) کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ جو "مقام حدیث" کے مجموعہ میں ملے گا۔

کے عقیدہ نے یہ کیا کہ جن احکام کی تفاصیل قرآن نے متعین کی ہیں وہ بھی ناقص ہیں اور ان کی تکمیل و ترمیم وحی غیر متلو کے ذریعے ہوتی ہے جس کا دروازہ کم از کم، امام بخاری اور مسلم کے زمانے تک ضرور کھلا تھا۔

کیوں سلیم! کچھ بات سمجھ میں آئی؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خلجان پیدا ہو رہا ہے کہ (۱) اس اعتراض کا صحیح جواب تو ابھی تک سامنے نہیں آیا کہ قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین کیوں چھوڑ دیا اور (۲) یہ کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ مسلمانوں میں کس طرح رائج ہو گیا! اگر تم نے اصل مضمون کا وقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو ان اعتراضات کے جواب بھی وہیں سے مل جاتے۔ لیکن اس دفعہ تو تم نے بھی وہی کچھ کیا جو عوام کیا کرتے ہیں کہ جوں ہی کوئی ایسا خیال سامنے آیا جو ان کے کسی مروجہ عقیدہ کے خلاف ہو، انہوں نے بلا سوچے سمجھے اعتراضات شروع کر دیئے۔ یہ روش تو تمہاری افتاد کے خلاف تھی۔ لیکن تمہاری معذوری پر میری نگاہ ہے۔ جو عقائد نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آئیں وہ انسان کے نفس غیر شعوریہ کی گہرائیوں میں مسلم صداقتیں بن کر جاگزیں ہو جاتے ہیں اور آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتے اس لئے اب آؤ ان اعتراضات کی طرف۔

اصولی اور فروعی قوانین کا فرق

تم جانتے ہو کہ قرآن تمام دنیا کے لئے ضابطۂ قانون ہے۔ قانون میں ایک چیز ہوتی ہے اصول اور ایک چیز فرع Bye-law قرآنی ضابطۂ قانون کے اصول

وہ مستقل اقدار ہیں جو ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہیں۔ لیکن ان اصولوں کی فروعات، انسان کی تمدنی زندگی کے ان عملی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں جو مختلف زمانوں کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ فروعات غیر متبدل نہیں ہو سکتیں قرآن نے (بجز چند ایک فروعات کے) انسانی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق قوانین کے اصول بتائے ہیں اور ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ قرآن کا ایک ایک حرف غیر متبدل ہے (لاتبدیل لکلمات اللہ) اگر قرآن جزئیات بھی خود ہی متعین کر دیتا تو ان میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تغیر و تبدل نہ ہو سکتا (جیسا کہ ان چند جزئیات میں نہیں ہو سکتا جو اُس نے متعین کر دی ہیں اور جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ منشائے ایزدی یہی تھا کہ انہیں غیر متبدل رکھا جائے)، اس لئے اس قسم کا ضابطۂ قانون (جس میں تمام جزئیات غیر متبدل ہوتیں) تمام نوع انسانی کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات قرار نہ پا سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہودیت عیسائیت، ہندومت وغیرہ آج ناکام کیوں ہوئے ہیں! انہیں ان کے پیرووں نے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ انہوں نے اپنے اپنے مذہب کو خوشی سے نہیں چھوڑا۔ انتہائی مجبوری کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ مجبوری کیا تھی؟ یہی کہ جو مذہبی رسوم و قیود (یعنی جزئیات قانون) کسی زمانہ میں متعین ہوئیں وہ ان مذاہب میں غیر متبدل قرار پا گئیں۔ وہ جزئیات عصر حاضر کے انسان کے تمدنی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں۔ ارباب مذہب (اس عقیدہ کی بنا پر کہ وہ غیر متبدل ہیں) اُن کی پابندی پر

مصر تھے۔ کچھ عرصہ یہ کشمکش رہی اور بالآخر ان کے معتقدین، وقت کے اٹل تقاضوں سے
ایسے مجبور ہوئے کہ انہیں ان جزئیات کو جھٹک کر پھینک دینا پڑا اور چونکہ ان کی
آسمانی کتاب ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں اس لئے ان جزئیات کے
ساتھ ہی مذہب بھی گیا۔ درحقیقت ان کے ہاں مذہب نام ہی ان جزئیات کا رہ گیا تھا۔
تم نے دیکھا سلیم! کہ یہودیوں کو تالمود کی جزئیات عیسائیوں کو سینٹ پال کی جزئیات
اور ہندوؤں کو منوجی کی جزئیات، جنہیں ابدی اور غیر متبدل کہا جاتا تھا، کس طرح
زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر الگ کرنی پڑیں۔ قرآن کے پیش نظر، جہاں انسانی
زندگی کے نشو و ارتقا کے لئے مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول تھے وہاں اس کی
تمدنی زندگی کے ہمیشہ بدلنے والے تقاضے بھی تھے۔ اس لئے اس نے ایسا ضابطۂ
حیات دیا جس میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا تھا اور
یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اس میں نوع انسانی کے لئے ابدی ضابطۂ حیات
بننے کی صلاحیت ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے سلیم! کہ قرآن نے جزئیات کو اس لئے
متعین نہیں کیا کہ وہ انہیں قابل تغیر و تبدل رکھنا چاہتا تھا۔ اگر کسی ایک زمانے
میں متعین شدہ جزئیات ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنی مقصود ہوتیں تو قرآن انہیں
خود ہی متعین کر دیتا۔ لہٰذا قرآن کی غیر متعین جزئیات کو کسی ایک زمانے میں متعین
کر کے انہیں آئندہ کے لئے غیر متبدل قرار دے دینا دین کی اس صلاحیت کو سلب
کر لینا ہے جس کی بنا پر یہ ابدی طور پر ضابطۂ حیات بن سکتا ہے۔ ذرا سوچو سلیم!

کہ اگر کسی اسلامی حکومت کو یہ مجبوری ہو کہ وہ کسی حالت میں بھی اڑھائی فی صدی سے زیادہ انکم ٹیکس عائد نہ کر سکے اور وہ ٹیکس (زکوٰۃ) بھی سال بھر کے فاضلہ اثاثہ Surplus Assets پر ہو تو وہ حکومت کبھی چل سکتی ہے ؟ قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دے کر اس کی شرح وقیود کو غیر متعین چھوڑ دیا تاکہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود متعین کرتی رہے۔ قرون اولیٰ میں خلافت راشدہ نے اپنی ضرورت کے مطابق اڑھائی فی صدی مناسب سمجھا اُس وقت یہی شرح شرعی تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت سمجھے کہ اس کی ضروریات کا تقاضا بیس فی صدی ہے تو یہی بیس فی صدی شرعی شرح قرار پا جائے گی۔

یہ ہے وہ مصلحت کہ جس کی بنا پر قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دیا۔ اب کسی ایک وقت کی متعین کردہ جزئیات کو ابدیت سے ہمکنار کر دینا اس دین کو غیر فطری بنا دینا ہے۔ سلیم تم مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہو کہ عصر حاضر کا مسلمان اگر مذہب سے بیگانہ بلکہ سرکش ہو رہا ہے تو اس لئے کہ اسے ان جزئیات کو ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو اس کے موجودہ زمانے کے تقاضوں میں فٹ نہیں بیٹھتیں۔ اگر اس زمانے کے مسلمان کے سامنے قرآن کے اصول رکھ دیئے جائیں اور اس کے بعد اس سے کہا جائے کہ ان اصولوں کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے والی جزئیات خود

متعین کرلو، تو دیکھو وہ کس طرح لبیک اللّٰھم لبیک کہتا ہوا اس حریم فطرت کے گرد مستانہ وار طواف کرنے لگتا۔ قرآن کی تو یہ کیفیت ہے سلیم! کہ

صد جہان تازہ در آیات اوست	عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
بندۂ مومن ز آیات خداست	ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چو کہن گردد جہانے در برش	می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب دوسری شق کو لیجیے یعنی یہ کہ یہ جزئیات غیر متبدل کس طرح قرار پاگئیں؟ اسی کو بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ کیسے پیدا ہو گیا۔

جزئیات بدلنے والی چیز ہیں

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے، قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ان کا تعین خود کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی حکومت کی تشکیل فرمائی اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متعین جزئیات کو متعین فرمایا۔ آپؐ کے بعد خلافت راشدہ کے زمانے میں ان جزئیات میں حسب ضرورت اضافے بھی ہوئے اور ترمیمات بھی۔ خلفائے راشدین نے ایسے فیصلے دیئے جو حضورؐ کے فیصلوں سے مختلف تھے اور یہ کہہ کر دیئے کہ ہمارے زمانے کے حالات کا یہی تقاضا ہے۔ سلیم! تم حیران ہو گے کہ وحی غیر متلو کے عقیدہ کا سراغ نہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کہیں ملتا ہے نہ صحابہؓ کے عہد میں۔ وہ زمانہ اس اصطلاح سے قطعاً

ناواقف نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک وحی ایک ہی تھی اور وہ قرآن میں محفوظ تھی۔ اس سے باہر وحی کہیں نہ تھی اس لئے خارج از قرآن کوئی چیز غیر متبدل بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور سلاطین نے امور سلطنت اپنے ذمہ رکھ لئے اور امور دین کو انفرادی طور پر علماءؔ کے سپرد کر دیا تو قرآنی اصولوں کی جزئیات متعین کرنے کا جو اسلوب قرآن نے بتایا تھا (یعنی اسلامی نظام مملکت کی وساطت سے) وہ خود بخود مٹ گیا۔ اندازہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ذمے امور دین کا تحفظ قرار پایا انہوں نے سوچا کہ مرکزی قوت (حکومت) نے جزئیات کو قانون کی حیثیت دے کر نافذ کرنے کا طریقہ ترک کر دیا ہے۔ اس لئے اگر مروجہ جزئیات کے متعلق یہ کہدیا گیا کہ وہ صرف اُس زمانے کے لوگوں کے لئے شریعت تھیں جن کے لئے انہیں مرتب کیا گیا تھا تو ملت شریعت کے بغیر رہ جائے گی اور اس طرح ان میں سخت انتشار (Anarchy) پھیل جائے گا۔ لہٰذا ملت کو کسی آئین پر پابند رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس وقت کی مروجہ جزئیات کو غیر متبدل

ؔ علماء کا ایک جداگانہ طبقہ اور مولوی اور مولانا کے الفاظ نہ عہد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کہیں دکھائی دیتے ہیں نہ زمانہ خلافت راشدہ میں۔ یہ بھی اسی زمانہ کی پیداوار ہیں جب سلطنت دین سے الگ ہو گئی اور "قیصر اور پوپ" کے دوائر منصب جداگانہ قرار پا گئے۔ "حضرت مولانا ابوبکر صدیقؓ اور حضرت مولوی عمر فاروقؓ" آج بھی کس قدر نامانوس نظر آتے ہیں۔

قرار دے کر واجب التعمیل ٹھیرا دیا جائے۔ ان کو غیر متبدل قرار دینے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ انہیں تمام و کمال ذات رسالت مآب کی طرف منسوب کر دیا جائے اور یہ کہدیا جائے کہ حضورؐ نے انہیں بذریعہ وحی متعین فرمایا تھا اس لئے یہ ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انہیں وحی قرار دینے میں غالباً یہ مصلحت بھی تھی کہ جو لوگ ذاتی اجتہادات سے مسائل میں استنباط کر کے جزئیات متعین کر رہے تھے (یعنی اہل فقہ) اس عقیدے کی رو سے اُن کے مخالف گروہ (اہل حدیثؒ) کو ان کے رد کی ناقابلِ تردید دلیل مل جاتی تھی۔ یعنی ایک چیز کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اسے حضورؐ نے بذریعہ وحی متعین فرمایا اور دوسری کے متعلق یہ کہ اسے (مثلاً) امام ابو یوسفؒ نے اپنی رائے سے متعین کیا تو ظاہر ہے کہ اس کی جبین عقیدت اول الذکر کے سامنے جھکے گی۔ جہانتک میں سمجھ سکا ہوں سلیم! جزئیات کو غیر متبدل قرار دینے کا اولین جذبۂ محرکہ یہی تھا[1]۔ یعنی ملت کو بالکل بے زمام چھوڑ دینے یا اشخاص کی ذاتی آراً کے تابع کر دینے کے بجائے انہیں تقلید کی حدود میں مقید کر دیا جائے۔ یہ طریقہ ایک اضطراری حالت کے لئے وقتی علاج تو ضرور تھا لیکن اس سے وضع احادیث کا اتنا

[1] میں اس وقت اس سازش سے بحث نہیں کر رہا جو عجمی عناصر، یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت نے اسلام سے انتقام لینے کی غرض سے کی اور جس کی رو سے انھوں نے روایات سازی کے راستے اپنے خیالات اور عقاید کو عین اسلام بنا کر دکھایا۔ اس کے متعلق دوسرے مقامات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لئے جن لوگوں نے نیک نیتی سے اس قسم کا عقیدہ پیدا کیا ان کے پیش نظر غالباً اس قسم کی مصلحت تھی۔ اور اگر یہ مصلحت نہ تھی تو لا محالہ کہنا پڑے گا کہ وہ بھی اس عجمی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔

بڑا دروازہ کھل گیا کہ جو کچھ کسی کے جی میں آیا اُس نے قال رسول اللہ ؐ کے عنوان سے دو چار رواۃ کی تائید کے ساتھ گھڑا اور اسے جزو دین بنا دیا۔ اب یہی دین ملت کے لئے ابدی طور پر ناقابلِ تغیر شریعت بن گیا۔ جب تک حکومت اور مذہب کی یہ تفریق باقی رہی یہ سوال عملی طور پر بے معنی تھا کہ یہ جزئیات جو تقلیدی طور پر اسلاف سے منتقل ہوتی آ رہی ہیں علیٰ حالہٖ رہنی چاہئیں یا ان میں تغیر و تبدل ہونا چاہیئے اس لئے کہ حکومت سے الگ ہٹ کر یہ جزئیات مذہبی رسوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ زکوٰۃ اڑھائی فی صدی ہوتی یا چالیس فی صدی دونوں صورتوں میں خیرات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اب بھی جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے لیکن مذہب حکومت سے الگ ہے، وہاں ان جزئیات کی حیثیت مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہاں حکومت کے ٹیکس الگ ہیں اور زکوٰۃ بطور خیرات دی جاتی ہے اس لئے اس سے پہلے اس سوال نے عملی حیثیت اختیار نہیں کی لیکن حصول پاکستان کے بعد یہ آواز ہر در و دیوار سے اٹھنی شروع ہو گئی ہے کہ اس کا آئین شرعی ہونا چاہیئے (اور یہی تشکیل پاکستان کا مقصد بھی ہے) لہٰذا اب سوال نے بھی عملی شکل اختیار کر لی ہے کہ یہ جزئیات جو ہمارے ہاں متوارث چلی آ رہی ہیں، ناقابل تغیر ہیں، یا ان میں زمانے کے مقتضیات کے مطابق تغیر و تبدل بھی ہو سکتا ہے۔ جو لوگ دل سے چاہتے ہیں کہ یہاں نظام شریعت رائج کیا جائے وہ بھی اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر شریعت ان ہی جزئیات کے مجموعہ کا نام ہے جسے

ارباب شریعت ناقابلِ تغیر قرار دے رہے ہیں تو پاکستان کا نظام چل کیسے سکے گا؟ ارباب شریعت کا اصرار ہے کہ یہ جزئیات ناقابل تغیر و تبدل ہیں۔ انہیں چھوا تک نہیں جا سکتا۔ اس لئے انہیں اسی طرح اختیار کرنا ہو گا۔ انہیں اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ ایسا کرنے سے ہم اس زمانے میں زندہ بھی رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ تقلید کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے اور اعمال کو کبھی نتائج سے نہیں پرکھا جاتا۔ تمہیں یاد ہے کہ ہم ایک دفعہ دہلی میں ایک پریس میں گئے تھے۔ وہاں ایک بہت بڑی روٹری مشین پوری سرگرمی سے چل رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر، پورے زور و شور کے ساتھ

اگر ایسا نہ ہوا تو؟

لیکن اس کے تختہ پر کاغذ نہیں تھا اس لئے گو مشین تو چل رہی تھی لیکن چھپتا کچھ نہیں تھا۔ مسلمانوں کے اعمالِ مذہبی کی مشین صدیوں سے چل رہی ہے لیکن اس پر چھپتا کچھ نہیں اولئک حبطت اعمالھم (ان کے عمل بے نتیجہ رہتے ہیں) اور ضل سعیھم (ان کی کوششیں رائیگاں)، لیکن اب سلیم! خدا خدا کر کے ہمیں ایک ایسا موقع ملا ہے جس میں حکومت ہمارے ہاتھ میں ہے اور ملوکیت کا استبداد و تغلب ہنوز ہم پر مسلط نہیں ہوا۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ جس قسم کا آئین چاہیں بنا لیں۔ صدیوں کے بعد پھر وہ وقت آیا ہے کہ ناموس فطرت ہم سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

تو اپنی سرنوشت پھر اپنے قلم سے لکھ خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اگر سلیم! اس وقت ہم نے مبداءِ فیض کی اس موہبتِ کبریٰ سے فائدہ نہ اٹھایا تو اس کے بعد قرآن ہماری زندگی کا ضابطۂ حیات کبھی نہیں بن سکے گا۔ اور ہم آزادی کی فضائے بسیط میں کبھی سانس نہیں لے سکیں گے۔ میں سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر اپنے درد و کرب کی تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنہوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ سلیم

میرے دیدۂ ترکی بے خوابیاں   میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز   میری خلوت و انجمن کا گداز

تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ

نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

مجھے سلیم! یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ ہمارے نظامِ شریعت کے دعویدار وہی ہیں جن کا ایمان ہے کہ فقہ و روایات کی وہ جزئیات جو ہزار سال پیشتر وقتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ اس لئے وہ ان ہی جزئیات کے مجموعہ کو قانونِ شریعت بنا کر سامنے لے آئیں گے جو آج کے حالات میں کبھی قابلِ عمل نہ ہو سکے گا اور مسلمان ایسا بدکے گا کہ دوبارہ اُس کی طرف رُخ نہیں کرے گا۔

اور اس طرح اللہ کی یہ نعمتِ عظمیٰ ہماری شامتِ اعمال سے بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ صرف ہم پر ہی ظلم نہیں ہو گا بلکہ تمام نوعِ انسانی پر ظلم ہو گا کہ اس سے انسانیت اس نور سے محروم رہ جائے گی جس میں اسے اپنے شرف و مجد کی ارتقائی منازل طے کرنی تھیں۔ وذالک خسران المبین

رسول پر ایمان

سلیم! تم کہتے ہو کہ جب اصولِ قانون، اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے اور ان کی جزئیات امت نے اپنے اپنے زمانے میں متعین کیں تو رسول اللہ صلعم پر ایمان لانے سے کیا مفہوم ہو گا! تمہارے اس سوال پر مجھے حیرت ہوئی اس لئے کہ تم کبھی اس قسم کا سطحی اعتراض نہیں کیا کرتے تھے۔ ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو اس کے پاس اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے (معاذ اللہ) رسول اللہ کا خود ساختہ نہیں۔ تاریخ شاہد ہے (اور اس کا مسلمان کو خود اقرار ہے) کہ دنیا کو قرآن، محمد ابن عبد اللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا؛ اس کا صرف ایک ثبوت ہے کہ خود محمدؐ ابن عبد اللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ کلام میرا نہیں، خدا کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائے قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اور قرآن ہی حکومتِ خداوندی کا ضابطہ قانون ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی رسالت پر ایمان اس وقت تک وجہ شرف انسانیت ہے جب تک انسان اللہ کی حکومت کو باعث احترام آدمیت سمجھتا ہے[۱]۔ پھر اسے بھی سوچ سلیم! کہ اس حقیقت سے بھی تو ہمیں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آشنا کرایا کہ قرآنی اصولوں کی جزئیات خود ہمیں متعین کرنی ہیں۔ اگر حضورؐ انہیں متعین کر کے حکومت خداوندی کو متشکل نہ فرماتے تو ہمیں کیا معلوم ہوتا کہ منشائے خداوندی کیا ہے؟ لیکن حضورؐ کی سیاست تو اسی میں تھی کہ آپ نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر دیا اور صحیح حریت فکر و نظر عطا کر کے اسے ان اغلال و سلاسل کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جس میں وہ جکڑا ہوا چلا آتا تھا۔ یہ اغلال و سلاسل تھے وہ استبداد، جو ملوکیت اور برہمنیت کی شکل میں انسانی اعصاب پر سوار تھا۔ حضورؐ نے بتایا کہ انسان کا تعلق اس کے خدا کے ساتھ براہ راست ہے اور خدا اور بندے کے درمیان، اور تو اور، خدا کا رسول بھی حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ انداز حکومت (کہ اصول خدا نے متعین کئے ہیں اور ان کی جزئیات انسان خود متعین کریں گے) خدا اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے وہ عدیم المثال تعلیم جسے قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم
یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا

---

[۱] اس باب میں مزید وضاحت کسی دوسرے مقام پر پیش کی جائے گی۔

رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡکِتٰبَ وَبِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ (۳:۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب وحکومت ونبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا سے ہٹ کر میرے بندے بن جاؤ (اس کا شیوہ یہ ہوگا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ) تم سب ربانی انسان بن جاؤ (اور اس کا طریق یہ ہے کہ) تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

رسول کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے فقید المثال عمل سے انسانوں کو یہ سکھائے کہ وہ کس طرح ربانی انسان بن سکتے ہیں۔ یعنی ان کا اور ان کے خدا کا براہ راست تعلق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے اور اس تعلق کا ذریعہ کتاب اللہ ہے۔ اس تعلق کی عملی شکل پہلے رسول اللہؐ نے خود متعین کر کے دکھائی۔ آپؐ کے بعد امت کو چاہیئے تھا کہ اس تعلق کو مسلسل قائم رکھے۔ لیکن امت بہت جلد اس رستہ سے بھٹک گئی اور اس نے اپنے اور خدا کے درمیان وہی انداد (غیر خدائی قوتیں) حائل کر لئے جنہیں درمیان سے ہٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اور جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہٹا کر پھینک دیا تھا۔ یہ انداد من دون اللہ کہیں ارباب سیاست تھے اور کہیں احبار و رہبان۔ جنہوں نے خدائی احکام کی جگہ اپنے احکام کی پرستش کرائی۔ کسی نے قیاسات کی رو سے کسی امام کا آسرا لیا اور کسی نے روایات کے راستے خود رسول اللہؐ کا سہارا پکڑ کر۔ حالانکہ نہ ان ائمہ نے اس کی تلقین کی تھی اور نہ رسول اللہؐ نے اس کی تعلیم دی تھی کہ یہ جزئیات

قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ تو پھر سلیم! کوئی وقت تو ایسا آنا چاہیئے جب امت کو بے راہ روی سے روک کر اسے راستہ پر لگایا جائے جس سے اس کے اور اس کے خدا کے درمیان پھر براہ راست تعلق پیدا ہو جائے۔ میرے نزدیک پاکستان نے وہ موقعہ ہم پہنچا دیا ہے۔ لیکن اگر اب بھی ہمارے اور ہمارے خدا کے درمیان وہی انداداً من دون اللہ حائل رہے۔ یعنی یا حکومت ارباب سیاست کے اپنے تصوّرات کے مطابق قائم ہو گئی یا ہمارے احبار و رہبان کی اشخاص پرستی کے معتقدات کے مطابق تو پھر خدا اور بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ شاید دوبارہ نہ جڑ سکے۔

یہ خدشہ ہے سلیم!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیوں، اور میرے دل کی پوشیدہ بیتابیوں کا باعث۔

اسلامی نظام چند قوانین کے مجموعے کا نام نہیں

اس آخری ٹکڑہ سے سلیم! تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ "اسلامی نظام" محض چند قوانین کے مجموعے کا نام نہیں جو کسی قوم (یا ایک حکومت کے تابع آجانے والے انسانوں) کی اجتماعی زندگی میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے میکانکی طور پر نافذ کر دیئے جائیں گے۔ قانون کیا ہے؟ انسانوں کو ان افعال سے روکنے کا ذریعہ جن سے ان کی تمدنی زندگی میں فساد و انتشار

واقعہ ہوتا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف قوموں (یا جماعتوں اور سلطنتوں) نے مختلف انداز وطرق (قوانین) وضع کیے ہیں۔ ان میں اکثر قوانین مشترک بھی ہیں۔ مثلاً قاتل کی سزا (موت) انگریز کے قانون میں بھی وہی ہے جو قرآن کے قانون میں ہے۔ اس اعتبار سے انگریز کے قانون اور ہمارے شرعی قانون میں کوئی فرق نہیں۔ اب فرض کرو کہ اگر انگریز مختلف جرائم کی وہی سزائیں اپنے ہاں رائج کر لیتا ہے جنہیں ہم شرعی حدود کہتے ہیں تو کیا سلیم اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ انگریز کا نظام زندگی اسلامی ہو گیا؟ بالکل نہیں۔ ایک قدم آگے بڑھو۔ اگر ہم بھی اپنے ہاں جرائم کی وہی سزائیں تجویز کر لیں جنہیں شرعی تعزیرات کہتے ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ ہمارا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا! ہر گز نہیں۔ اس سے سلیم! تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ فقط شرعی قوانین جرم و سزا کو نافذ کر دینے کا نام اسلامی نظام نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوانین شرعی، نظام اسلامی کا ایک جزو ہیں۔ اس وقت تک جس قدر مطالبات پیش ہو رہے ہیں وہ محض قوانین شرعی کی تنفیذ کے لیے ہو رہے ہیں۔ اگر ہماری حکومت ان شرعی قوانین کو اختیار کر لے تو ہمارے ارباب شریعت مطمئن ہو جائیں گے کہ "حکومت خداوندی" کا قیام ہو گیا۔ لیکن اِدھر ان قوانین کا نفاذ ہو گا اور اُدھر ان قانونی موشگافیوں کے ذریعہ ان قوانین کی گرفت سے بچنے کے حیلے وضع کیے جائیں گے۔ سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ ہماری فقہ کی

کتابوں میں ایک باب الحیل بھی ہوتا ہے۔ یعنی وہ حیلے جن سے مجرم قانونی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ تم حیران ہوگے کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں! لیکن سلیم! میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو ان کتابوں کو اکٹھا کر خود دیکھ لو اور پھر علامہ ابن قیمؒ کی اعلام الموقعین دیکھو جس میں ان "شرعی حیلوں" کا رد کیا گیا ہے۔ تمہاری دلچسپی کے لئے ان حیل میں سے ایک حیلہ مثالاً لکھتا ہوں۔ اس سے تم سمجھ بھی جاؤ گے کہ "شرعی حیلوں" سے مفہوم کیا ہے۔ دو آدمیوں نے مل کر ایک مکان سے مال چرایا اور موقعہ پر گرفتار ہوگئے۔ عدالت میں پیش ہوئے۔ جرم ثابت تھا۔ شرعی تعزیر کی رُو سے چور کا ہاتھ کاٹنا چاہیئے۔ لیکن اب دیکھئے کہ یہ کس طرح سزا سے بچتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ سرکار! میں نے صرف نقب لگائی ہے۔ نقب لگانا چوری نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے بیشک مال اکٹھا کیا اور اسے لیکر چلا۔ لیکن منقوب دوکان میں پڑا ہوا مال، مالِ محفوظ نہیں کہلا سکتا۔ اور چوری مال محفوظ کو لیجانے کا نام ہے، لہٰذا مجھ پر چوری کا جرم عاید نہیں ہو سکتا۔ لیجیئے دونوں چور چوری کے جرم سے بری ہوگئے۔ اب ان پہ کوئی اور فرد جرم لگایئے۔ اس قسم کے حیلے سلیم! روز عدالتوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ وکلاء کے معاش کا بیشتر حصہ اسی قسم کی حیلہ تراشیاں ہیں۔ لہٰذا محض شرعی قوانین کے تنفیذ سے نفوس میں اصلاح نہیں ہو سکتی قلوب میں انقلاب قرآنی نظام ربوبیت کے قیام سے ہوگا۔ یہ نظام کیا ہے؟ وہ اسے

شرعی حیلے

میں اس خط میں نہیں سمجھا سکتا۔ اسے دوسرے وقت لکھوں گا۔ قرآنی نظام ربوبیت[1]

قرآنی نظام ربوبیت

انسانی زندگی کو اس طرح محیط ہوتا ہے جس طرح فضا کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہوا انسانی جسم کو لپیٹے ہوتی ہے اور جس طرح یہ کرۂ ہوائی اس کی زندگی کا مدار و اساس ہوتے ہوئے اس کی آزادیوں میں کہیں خلل انداز نہیں ہوتا۔ چلتے چلتے، چند الفاظ میں سلیم! یوں سمجھ لو کہ

(۱) کائنات ایک مقصد کے ماتحت پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس منزل مقصود کی طرف رواں دواں جا رہی ہے۔

(۲) اسی طرح انسان کی زندگی بھی ایک مقصد لئے ہوئے ہے اور اس کی تگ و تاز کا منتہیٰ اس نصب العین کی طرف بڑھنا ہے۔

(۳) خارجی کائنات میں ہر شے بلا اختیار و ارادہ اس مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

(۴) لیکن انسان اپنی دنیا میں صاحب اختیار و ارادہ ہے اس لئے اسے اس نصب العین کی طرف اپنے نظام اجتماعیہ کی رو سے بڑھنا ہوگا۔

(۵) اس نظام اجتماعیہ کا نام الدین یعنی اسلامی نظام زندگی ہے۔ جس کی بنیاد وحدتِ خالق، وحدتِ قانون، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ مقصد

---

[1] اس کے متعلق اس کے بعد طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ نیز سلیم کے نام خطوط کے مجموعے میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ آچکا ہے۔ یہ مجموعہ الگ شائع ہو رہا ہے۔

پر ہے۔

(۲) اس نظام کا اولین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ہر فرد معاشرہ کی تمام انسانی صلاحیتوں کے کامل طور پر نشو و نما پانے کے لئے تمام اسباب و ذرائع ہر ایک کے لئے یکساں طور پر میسر ہوتے ہیں۔ اس کو نظام ربوبیت کہتے ہیں۔ اس نظام کی رو سے تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔

لہذا قوانین تعزیرات اس نظام کا ایک جزو ہیں جو افراد معاشرہ کی اجتماعی زندگی میں بدعنوانیوں کی روک تھام کے لئے نافذ کئے جاتے ہیں۔

چونکہ اس وقت بحث صرف یہ تھی کہ شرعی قوانین کی ترتیب و تدوین کس طرح عمل میں آئے گی۔ اس لئے میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" میں اپنے آپ کو صرف اسی نقطہ تک محدود رکھا ہے۔ اس مضمون کے عنوان سے اس کو اسلامی نظام نہ سمجھ لینا۔ اس مضمون میں اسلامی نظام کے صرف ایک گوشے سے بحث کی گئی ہے۔ یہ چیز کہ یہ گوشہ (یعنی ضابطہ قوانین) کس طرح پورے نظام کا جزو بن کر اس مقصد عظیم کے حصول میں ممد ہوتا ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک پورے کا پورا اسلامی نظام اور اس کا منتہیٰ آپ کے سامنے نہ ہو۔ اس کے لئے سلیم!

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر[1]

---

[1] دیکھئے مسودہ دستور اساسی پیش کردہ طلوع اسلام۔

اب سلیم! تمہاری آخری بات کا جواب آتا ہے۔ یہ نہیں تسلیم ہے کہ ایسے معاملات سامنے آسکتے ہیں جن کی جزئیات نہ قرآن نے متعین کی ہیں اور نہ وہ کہیں روایات میں ملتی ہیں اب اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جزئیات کی تعیین صرف رسول ہی کر سکتا ہے تو ان امور کی جزئیات کو کون متعین کرے گا؟ اس لئے کہ اب بابِ رسالت تو بند ہو چکا ہے۔ یہ تھی وہ الجھن جس کے لئے کہیں ہر صدی کے اخیر ایک مجدد کا عقیدہ وضع کرنا پڑا اور کہیں مہدی آخرالزمان کا انتظار اٹھانا پڑا۔ اسی سے مدعیانِ نبوت نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے نبوت کا دروازہ کھول دیا۔ اگر یہ سمجھ لیا جاتا کہ جزئیات کی تعیین امت کا فریضہ ہے تو پھر نہ کسی الگ مجدد کی ضرورت پڑتی، نہ کسی جداگانہ مہدی کی۔ نہ یہ کرسیاں رکھی جاتیں نہ اُن پر کوئی نبی بن کر بیٹھنے کی جرأت کرتا۔ تجدید وہدایت کا سلسلہ مسلسل ومتواتر قائم رہتا۔ لیکن مسلمانوں نے یہ نہ کیا اور جب اس غلط بینی سے پیچیدگیاں پیدا ہوئیں تو ان کے ایسے ایسے حل تجویز کئے جن سے وہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہوتا چلا گیا۔ تم کہتے ہو کہ اس قسم کے امور کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ یہی میں کہتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ جو اجتہاد پہلے ہو چکا ہے اس میں مزید اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اجتہاد کے محتاج ہوتے ہی وہ امور ہیں جن میں مقتضیات زمانہ کی رو سے ردوبدل ہو سکتا ہو۔ جن امور کو اللہ تعالیٰ نے کھلا چھوڑ دیا ہے ان میں کسی ایک زمانہ کا اجتہاد ابدی فیصلہ نہیں بن سکتا۔ اگر اسے ابدی فیصلہ بننا ہوتا تو اس کا فیصلہ خود قرآن کر دیتا اور اسے اجتہادِ انسانی کے لئے آزاد نہ رکھتا۔ البتہ ہم اپنے زمانے

کے اجتہاد کے لیے ان تمام اجتہادات سے مستفید ہوں گے جو ہم سے پہلے کیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اجتہاد انفرادی نہیں ہوگا۔ بلکہ ملت کے نمایندے تمام معاملات پر غور و فکر کے بعد اجتہاد کریں گے اور اس سے یہ جزئیات مرتب ہوں گی۔ یہ ہے وہ طریق جس سے ہم خدا کے ازلی اصولوں کی روشنی میں، جو درحقیقت انسان کی زندگی ہی کے ترجمان ہیں، ہر زمانے کے مسائل کے نئے نئے حل دریافت کرتے چلے جائیں گے۔ یہ ہے دینِ مبین۔

لایزال و وارداتش نو بنو ۔۔۔ برگ و بار محکماتش نو بنو

باطن او از تغیر بے غمے ۔۔۔ ظاہر او انقلابِ ہر دمے

خدا اور رسول کی اطاعت

میں نے اپنے مضمون اسلامی نظام میں جس حقیقت کو پیش کیا تھا یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے بہت سے ارباب فکر و نظر کو سوچنے پر آمادہ کر دیا۔ اکثر نے اس سے اتفاق کیا۔ بعض نے مزید وضاحت چاہی۔ اور کئی ایک نے اعتراض بھی کئے۔ میرے نزدیک یہ تمام آثار نیک ہیں۔ اس لئے کہ اعتراضات ہی سہی، اس سے کم از کم جمود و تعطل کی وہ برفانی سلیں کچھ تو پگھلیں جنہوں نے صدیوں سے ہمارے قوائے فکر و تدبر کو مفلوج کر رکھا ہے۔ اعتراضات میں اکثر محض جذباتی قسم کے تھے جو ایک سنجیدہ بحث میں درخور اعتنار نہیں سمجھے جا سکتے۔ باقی اعتراضات کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں قدر مشترک یہی سوال رہ جاتا ہے کہ جب قرآن نے اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو رسول کی اطاعت کس طرح کی جائے گی۔ اگرچہ میں اس سوال کا جواب شروع ہی سے دیتا چلا آ رہا ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحث ہنوز تشنۂ تکمیل ہے اور مزید وضاحت کی محتاج۔ بنا بریں، میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس ایک نقطہ کو اور واضح کیا جائے اور قرآن کریم کی روشنی میں اس حقیقت کو نکھار کر سامنے لایا جائے کہ اسلامی حکومت میں جو قرآن کی رو

سے قائم کی جائے گی، اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد مرکزی حکومت کی اطاعت ہے جو قرآنی احکام کو نافذ کرے گی۔

یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔ اسی کے یہ معنی ہیں کہ حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔

(۲) اطاعتِ خداوندی سے مراد ان قوانین کی اطاعت ہے جو اس نے رسول اللہ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچائے اور جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔

رسول کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کا پیغام (یعنی قوانین الٰہیہ) جو اسے بذریعہ وحی ملتا ہے لوگوں تک پہنچائے اسے ابلاغِ رسالت کہتے ہیں۔ اس میں اسے کسی تصرف یا تبدیلی کا اختیار نہیں ہوتا۔

رسول کا دوسرا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کرے جس میں خدا کے احکام زندہ فیصلوں کی حیثیت اختیار کرلیں اور انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ اسی نظام کے تابع زندگی بسر کرے۔ اس نظام میں اصولی طور پر وضع قوانین کا حق کسی کو حاصل نہ ہوگا۔ اسلامی مملکت کا منصب، قوانین خداوندی کا نفاذ ہوگا۔ اس لئے اس نظام میں قدم قدم پر اس کی تاکید ہوگی کہ اطاعت صرف قرآن کی ہوگی اور کسی کی نہیں۔ رسول بھی اسی

اطاعت صرف قرآن کی ہے

کی اطاعت کرے گا اور اس کے ساتھ باقی تمام وہ جماعت بھی جو اس نظام کے تابع ہوگی قرآن

میں بار بار یہ تاکید آپ کو نظر آئے گی کہ

اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ

اَوْلِیَآءَ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ ۝ (۷/۳)

اے افرادِ نسلِ انسانی! جو تمہارے پروردگار کی جانب سے، تم پر نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو، اور خدا کو چھوڑ کر اپنے ٹھیرائے ہوئے آقاؤں (اولیاء) کے پیچھے نہ چلو۔ (افسوس تم پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو۔[۱]

لیکن جب یہ اطاعت ایک حکومت کی شکل اختیار کرے گی تو ظاہر ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مرکز بھی ہوگا جہاں سے یہ احکام نافذ ہوں گے اور جس کے ذمے یہ فریضہ ہوگا کہ وہ اس کی نگرانی کرے کہ ان احکام پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس مرکزیت (Central Authority) کا نام منصب امارت یا امامت ہے۔ یہ امیر یا امام وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کا پابند ہوگا (ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم) اور یہ ظاہر ہے کہ رسول کی موجودگی میں اس سے بڑھ کر قوانین خداوندی کا فرمانبردار اور کون ہوگا؟ اس لئے اس نظام کا اولین امیر اور امام خود رسول ہوگا۔ یہ رسول کی دوسری حیثیت ہے۔ یعنی مرکزِ نظامِ حکومتِ الٰہیہ، امیر المومنین۔ امام المسلمین اس امیر کی حیثیت محض احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے والے کی ہوگی، یہ اپنی حکومت

[۱] میں نے اس مضمون میں درج شدہ آیات کے ترجمے میں عام روش کی پابندی کی ہے۔ اپنے خاص انداز کے مطابق ترجمہ نہیں کیا۔

انسانوں پر نہیں چلائے گا۔ اس لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتادیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ

لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے (انسانوں کی ہدایت کے لئے)

کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے

کہے "خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ" (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے

حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہیئے کہ ربانی انسان اس لئے کہ تم کتاب اللہ

کی تعلیم دیتے رہتے ہو، اور اس لئے کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول

رہتے ہو!

وہ یہی کہے گا کہ اللہ میرا اور تمہارا آقا ہے آؤ، مل جل کر اس کی محکومیت اختیار کریں

کہ یہی شرف انسانیت کو اس کے منتہیٰ تک لیجانے والی سیدھی راہ ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

(۱۹/۳۶)

اور بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے پس اسی کی عبدیت،

محکومیت و طاعت اختیار کرو، یہی (سچائی کا) سیدھا راستہ ہے۔

اس امیر کا سب سے بڑا شرف جس کی وجہ سے وہ امیر بنا ہے یہی ہے کہ وہ خدا کی

عبدیت میں سب سے سبقت لیا گیا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں حضورؐ کو بار بار اسی خطاب

(عبدہٗ) سے مخاطب کیا گیا ہے، مثلاً

فَاَوْحیٰ اِلیٰ عَبْدِہٖ مَآ اَوْحیٰ ۵ (۵۳/۱۰)

پس اللہ نے اپنے بندے (محمد) پر جو کچھ وحی نازل کرنی تھی، کی۔

اور اس اصل اعظم کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرانے کے لئے کہ اس نظام میں امیر کی حیثیت کیا ہے ہر اس شخص سے جو اس نظام میں داخل ہونا چاہے، سب سے پہلے دو باتوں کا اقرار لینا ضروری سمجھا گیا۔ ایک یہ کہ (۱) اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے، اور دوسرے یہ کہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو اس نظام میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں بیش ازیں نیست کہ وہ اللہ کے عبد (محکوم - غلام) اور اس کے رسول ہیں۔ خود رسول سے بار بار اس کا اعلان کرا دیا گیا کہ میں خود وحی کی اتباع کرتا ہوں۔ اور اس وحی کے ذریعے تمہیں غلط روش زندگی کے انجام و عواقب سے متنبہ کرتا ہوں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ۵ (۳۸/۶۵)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو کہ میں صرف تم کو غلط زندگی کے انجام و عواقب سے) ڈرانے والا ہوں۔ اور بجز اللہ واحد و غالب کے کوئی لائق عبادت (اطاعت) نہیں ہے!

اس سے ذرا آگے ہے۔

اِنْ یُّوْحٰۤى اِلَیَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۳۸/۷۰)

میرے پاس وحی صرف اس لئے آتی ہے کہ میں (منجانب اللہ) صاف صاف ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

دوسری جگہ ہے

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَاۤ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَ لَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِـعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۴۶/۹)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو "کہ میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں، (بلکہ) اور (تو اور) مجھ کو تو اس بات کا بھی علم نہیں کہ خود میرے اور تمہارے ساتھ کیا (سلوک) کیا جائے گا۔ میں تو اسی بات کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ تک وحی کے ذریعہ آتی ہے، اور میں تو بیش از بیش (خدا کے عذاب و عتاب سے) کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں، (اور بس)

اور اسی لئے بتکرار اس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ رسول کو صرف قرآن کے احکام نافذ کرنے ہیں

رسول صرف قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے	وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ

وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً
وَمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلٰكِنْ
لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ؕ إِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝
وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ
وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ ؕ
فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوبِهِمْ ؕ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ۝ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ
يَبْغُونَ ؕ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝

اور (اے پیغمبر اسلام! اسی طرح) ہم نے تمہاری طرف، سچائی کے ساتھ
کتاب بھیجی، ان کتابوں کی تصدیق کرنے والی جو پہلے سے موجود ہیں، اور
ان پر نگہبان، سو چاہیئے کہ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق ان لوگوں
کے درمیان فیصلہ کرو، اور جو سچائی تمہارے پاس آچکی ہے اسے چھوڑ کر
لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کی پیروی نہ کرو، تم میں سے ہر ایک گروہ کے
لئے ہم نے "ایک شرع" اور "منہاج" ٹھہرا دی ہے (یعنی انسانی زندگی
کا دستور العمل اور طور طریقہ ٹھہرا دیا) اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا

یعنی اختیار و ارادہ سلب کر کے پتھروں اور حیوانوں کی طرح ایک ہی روش پر چلنے پر مجبور کر دیتا) لیکن (تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا، اور اس لئے نہیں کیا) تاکہ جو کچھ (احکامات) دیئے گئے ہیں ان میں تمہیں آزمائے، (اور تمہارے لئے ترقی کی راہیں پیدا ہوں) پس نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ نکلنے کی کوشش کرو، (کہ اس آزمائش کا اصل مقصود یہی ہے) بالآخر تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے، پھر وہ تمہیں بتلائے گا کہ جن باتوں میں باہم کر اختلاف کرتے تھے، ان کی حقیقت کیا ہے۔

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تمہیں حکم دیا کہ جو کچھ خدا نے تم پر نازل کیا ہے، اسی کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، نیز اُن کی طرف سے ہوشیار رہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، اس کے کسی حکم (کی تعمیل و نفاذ) میں تمہیں ڈگمگا دیں، (یعنی ایسی صورت حال پیدا کر دیں کہ کسی حکم کا نفاذ عمل میں نہ آسکے) پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں، (اور حکم الٰہی نہ مانیں) تو جان لو خدا کو یہی منظور ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان پر مصیبت ڈالے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسانوں میں سے بہت سے انسان، (احکام حق سے) نافرمان ہیں۔

پھر جو لوگ احکامِ الٰہی کا فیصلہ پسند نہیں کرتے، تو وہ کیا چاہتے ہیں)
کیا جاہلیت کے عہد کا سا حکم چاہتے ہیں؟ (جب علم و بصیرت سے لوگ محروم تھے
اور اوہام و خرافات پر عمل کرتے تھے) اور ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھنے والے
ہیں اللہ سے بہتر حکم دینے والا کون ہو سکتا ہے؟

اسی سے لوگوں کو فراموش کردہ پیغام یاد دلانا ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ قف فَذَكِّرْ
بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ع (۵۰/۴۵)

(اے پیغمبر اسلام!) یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں ہم اس (کی حقیقت) سے
خوب واقف ہیں۔ اور آپ ان پر جبر و تشدد کرنے والے (بنا کر) نہیں بھیجے
گئے ہیں، آپ تو قرآن سے ایسے لوگوں کو نصیحت (و تبلیغ) کرتے
رہیے جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔

اسی سے انہیں خدا کے راستہ پر لانا ہے۔

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ۵ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۵ (۱۴/۱)

الف۔ لام۔ را
یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اتاری ہے، تاکہ لوگوں کو اُن کے پروردگار کے
حکم کی تعمیل میں، تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے کہ غالب اور ستودہ

خدا کی راہ ہے۔

اور ان کی راہ نمائی کرنا ہے۔

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۲۷/۹۲﴾

(اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ منجانب اللہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ) میں قرآن پڑھ پڑھ کر سناؤں۔ سو، جو کوئی (میری تبلیغ سے) راہ ہدایت پر آجائے گا تو وہ اپنے ہی فائدہ کے لئے ہدایت پائے گا۔ اور جو شخص گمراہ ہوگا (تو میرا کچھ نقصان نہیں) میں تو محض ڈرانے والے پیغمبروں میں سے ہوں۔

لیکن چونکہ نظام دین میں اللہ کے احکام مرکز سے نافذ ہونے تھے، اور یہ مرکزی قوت نافذہ رسول کی محسوس شخصیت میں تھی، اس لئے ان مرکزی احکام کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت قرار دیا گیا۔ ہمارے دینی نظام میں یہ ایک بڑا اہم نکتہ ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت سے دو الگ الگ، مطاعوں کی اطاعت متصور نہیں۔ اس لئے کہ جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے۔ حتیٰ کہ خود رسول کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتلا دیا گیا کہ اسے بھی قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکز نظام دین Central Authority ہے جہاں سے قرآنی احکام

نافذ ہوں۔ یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول سے مرکز ملت مراد ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور اس شرح وبسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ جب جنگ اُحد میں مسلمانوں کی جماعت میں خلفشار پیدا ہو گیا اور حضور تنہا رہ گئے تو آپ نے ان بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پھر اس شمع کے گرد جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبی اکرمؐ نے دی تھی، لیکن چونکہ یہ محض حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہ تھا، بلکہ آپ نے بہ حیثیت مرکز ملت یہ آواز دی تھی اس لئے اس آواز کو خدا اور رسول کی آواز قرار دیا گیا۔

اللہ اور رسول کا صحیح مفہوم

الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا .... اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۳/۱۷۱)

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے) باوجودیکہ (اس سے ذرا ہی پہلے وہ) زخم کھا چکے تھے، سو یاد رکھو، ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں یقیناً اُن کے لئے (اللہ کے حضور) بہت بڑا اجر ہے!

اسی لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ رسول کے بلاوے کو عام بلاوا تصور نہ کیا کرو، اس کی دعوت حکومت کے مرکز کی آواز ہوتی ہے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۚ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۴)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تم لوگ رسول کے بلانے کو (عام بلاوا) تصور نہ کرو، جس طرح تم ایک دوسرے کو آپس میں بلا لیا کرتے ہو (یاد رکھو) اللہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہے جو (دوسروں کی) آڑ لے کر (مسجد نبوی سے) کھسک جاتے ہیں لہٰذا جو لوگ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیئے کہ اُن پر (دنیا ہی میں) کوئی فتنہ نہ آن پڑے یا (آخرت میں) کوئی دردناک عذاب مسلط نہ ہو جائے۔

یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبی اکرمؐ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو خدا اور رسول کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس لئے یہ کہ مخالفت نظامِ اسلامی کی مخالفت تھی۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا

اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِى الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِى الْاَبْصَارِ ۝

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵۹/۴-۱)

(اے افرادِ نسلِ انسانی!) آسمان و زمین کی تمام مخلوقات خدا کی پاکیزگی بیان کرنے میں رطب اللسان ہیں اور وہ زبردست حکمت (و دانش) والا ہے۔

وہی ہے جس نے اُن اہلِ کتاب (یہودیوں) کو اُن کے گھروں سے پہلے ہی بار اکٹھا کر کے نکال باہر کھڑا کیا جنہوں نے کُفر (انکار) کی راہ اختیار کی (ان کی ظاہری شان و شوکت دیکھ کر) تمہارا یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ (اس طرح اپنے گھروں سے) نکل کھڑے ہوں گے اور وہ خود یہ گمان کئے ہوئے تھے کہ ان کے (مضبوط) قلعے انہیں اللہ (کے انتقام) سے بچائے رکھیں گے۔ چنانچہ اُن پر (غضب الٰہی) ایسی جگہ سے پہنچا کہ جس کو اُن کا خیال تک نہ تھا اور (اللہ نے) ان کے دلوں (کی گہرائیوں) میں (مسلمانوں کا) رعب و دبدبہ بٹھا دیا۔ (ان کی یہ حالت ہو گئی کہ) خود اپنے ہی گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اور (کچھ کو) مسلمانوں کے

ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے، سوائے ارباب فکر و دانش! (اس حالت کو دیکھ

کر، عبرت حاصل کرو! اور اگر اللہ اُن کی قسمت میں جلاوطنی نہ لکھ چکا ہوتا تو

(یقیناً) انہیں دنیا ہی میں (قتل کی) سزا دیتا، اور اُن کے لئے آخرت میں (بھی)

دوزخ کا عذاب (تیار) ہے!

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول (کے احکام و فرامین)

کی مخالفت کی ہے اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو)

اللہ (پاداشِ عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے۔

میدانِ جنگ میں مجاہدین کی تمام نقل و حرکت حضورؐ کی ہدایت کے مطابق ہوتی تھی اس

لئے کہ حضورؐ ہی مرکزِ ملت اور سپہ سالارِ جیوش اسلامیہ ہوتے تھے، اس اطاعت کو

اللہ اور رسول کی اطاعت کہا گیا ہے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ

رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ○ (۸/۴۶)

(اور اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) اللہ اور اس کے رسول (کے احکام) کی اطاعت

کرو، اور (باہمدگر) نہ جھگڑو، (کہ اس سے) تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری

ہوا اکھڑ جائے گی، اور (مصائب و آلام پر) صبر اختیار کرو، بلاشبہ اللہ صبر

کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

نظامِ اسلامی کے خلاف بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ

وہ خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْہِمْ وَاَرْجُلُہُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط ذٰلِکَ لَہُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۵/۳۳)

بلاشبہ اُن لوگوں کی جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں، (یعنی رہزن اور ڈاکو ہیں یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں، یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں، یا اُنہیں جلاوطن کر دیا جائے (یعنی جیسی کچھ سزا اُن کے لئے ضروری ہو، انہیں دی جائے) یہ اُن کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی اُن کے لئے عذاب عظیم ہے!

منافقین اس نظام کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے، اسے بھی خدا اور رسول کے خلاف حرب وضرب قرار دیا گیا۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ ط وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی ط وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّہُمْ لَکٰذِبُوْنَ ۵ (۹/۱۰۷)

اور (منافقوں سے وہ لوگ بھی ہیں) جنہوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنا

کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں (کفر (انکار) کریں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں، اور

ان لوگوں کے لئے ایک کمین گاہ پیدا کر دیں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے

رسول سے لڑ چکے ہیں وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا

کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو، لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے

ہیں۔

قریش عرب نے نبی اکرمؐ کو مکہ سے نکالا، مسلمانوں کو ہر طرح کی اذیتیں دیں، نظام

اسلامی کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور پھر بدر کے میدان میں پہنچ کر اُن

کے خلاف صف آرا ہو گئے، اُن کی اس محاربت و مخاصمت کو بھی اللہ اور رسول کے خلاف

سرکشی قرار دیا گیا۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ

رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۸/۱۳)

یہ سب کچھ (سزا و عتاب) اس لئے ہے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی

مخالفت کی ہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول (کے احکام) کی مخالفت کرتا

ہے تو (یاد رکھو) بلاشبہ اللہ (پاداش عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے!

دوسری جگہ ان ہی مخالفین کے متعلق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ

قَبْلِهِمْ وَقَدْ أَنْزَلْنَا آيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ؕ
(۵/۵۸)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ (دنیا میں بھی) ایسے ذلیل

وخوار ہوں گے جس طرح ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے (کیونکہ) ہم نے کھلے

کھلے احکام و دلائل نازل کر دیئے ہیں اور منکرین (حق) کو (آخرت میں بھی ذلت

آمیز عذاب (کا برتاؤ) ہوگا۔

دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ ۝
(۵۸/۲۰)

(اور) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ لوگ ذلیل وخوار

لوگوں میں سے ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، کفار اور منافقین کی عہد شکنی کو خدا اور رسول کے خلاف

اعلان جنگ کہا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؕ
(۹/۱)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح وامن کا) معاہدہ

کیا تھا، اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا ان کے

لئے اعلان ہے!

پھر تیسری آیت میں ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ

اَنَّ اللّٰہَ بَرِیۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۙ۬ وَ رَسُوۡلُہٗ ؕ فَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَ اِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ غَیۡرُ مُعۡجِزِی اللّٰہِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۙ﴿۳﴾

اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔ (یعنی ان میں اور نظامِ حکومت خداوندی میں اب کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا) پس اگر تم (اب بھی ظلم و شرارت سے) توبہ کرلو، تو تمہارے لئے اس میں بہتری ہے اور اگر نہ مانو گے، تو جان رکھو تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اور (اے پیغمبر اسلام!) جو لوگ کفر کی راہ چل رہے ہیں انہیں عذاب دردناک کی خوشخبری سنادو!

پھر ساتویں آیت میں ہے۔

کَیۡفَ یَکُوۡنُ لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ عَہۡدٌ عِنۡدَ اللّٰہِ وَ عِنۡدَ رَسُوۡلِہٖۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ عٰہَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ۚ فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَکُمۡ فَاسۡتَقِیۡمُوۡا لَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۷﴾

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد و پیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں توڑا تو (ان کا عہد ضرور عہد ہے، اور) جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں، تم بھی اُن کے ساتھ

(اپنے عہد پر) قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں)

متقی ہوتے ہیں۔

غور کیجئے! یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے، اور اسی حکومت کے نمائندہ (حضرت علیؓ) کی وساطت سے یہ اعلانات ہو رہے تھے۔ لیکن انہیں اللہ اور رسول کے منشورات کہا گیا ہے۔ اس تبیانِ حقیقت سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی توجہات کو اس نقطۂ ماسکہ کی طرف مرکوز کیا جائے کہ اگرچہ یہ تمام احکام رسول کی طرف سے صادر ہو رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اللہ کے احکام ہیں، اس لئے کہ یہ نظام حکومت خداوندی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے ہیں۔

اس سے مرادِ مرکزِ نظامِ قرآنی ہے

جنگ احزاب میں جب مخالفین کے جیوش و عساکر سامنے آئے تو اُن کے متعلق مجاہدین نے کہا کہ یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کے متعلق حضور نے ارشاد فرمایا تھا لیکن اس کو بھی اللہ اور رسول کی طرف منسوب کیا گیا۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۲۲)

اور جس وقت مومنوں کی جماعت نے احزاب (کے جیوش و عساکر) کو دیکھا تو کہنے لگے کہ (ہاں) یہ تو (بالکل) وہی ہے جس کا اللہ اور رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور (بلاشبہ) اللہ اور اس کے رسول نے (بالکل) سچ کہا تھا۔ اور

اُن کے اس کہنے سے اُن کے ایمان و اطاعت میں دیکھیے نہ کچھ ترقی ہی ہو گئی۔

میں نے اپنی کتاب معارف القرآن جلد اول (عنوان نصرت) میں وضاحت سے بتلایا ہے، کہ اللہ کو مدد دینے سے مراد یہ ہے کہ اُس کے دین کی تقویت کا سامان بہم پہنچایا جائے اس نصرت کو بھی اللہ اور رسول کی نصرت کہا گیا ہے۔ مال فے کی تقسیم کے ضمن میں فرمایا

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ (۵۹/۸)

(مال فے) ان حاجتمند مہاجرین کا بالخصوص حصہ ہے جو اپنے گھروں اور مالوں سے (جبراً ظلماً) جُدا کر دیے گئے ہیں (اور اپنی اس مظلومانہ روش پر صبر و شکر کی بدولت) اللہ کے فضل و رضامندی کے جویا ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی (قیام دین میں) مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ (ایمان و اطاعت میں) سچے ہیں!

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے دین کے غلبہ، اسلام کے تمکن۔ حزب اللہ کی کامیابی و ظفرمندی کے متعدد مقامات پر وعدے کئے ہیں۔ اس غلبہ اور کامیابی کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ اور رسول کی کامیابی ہے

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۞ (۵۸/۲۱)

اللہ نے لکھدیا ہے کہ میں اور میرا رسول ہی غالب رہیں گے، بلاشبہ، اللہ قوت و غلبہ والا ہے!

ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اور تسلط، اسلامی حکومت ہی کا تمکن و تسلط تھا، ورنہ اللہ تو ہر جگہ غالب ہے، لہٰذا اللہ اور رسول کے غلبہ سے مراد نظام اسلامی کے غلبہ و استیلا ہی سے ہے۔ منافقین کی یہ حالت تھی کہ وہ عام مسلمانوں کو خوش رکھنے کی تدابیر سوچتے رہتے تھے لیکن نظام اسلامی کے دل سے مخالف تھے، ان کے متعلق فرمایا کہ یہ مسلمانوں کو تو راضی رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اللہ اور رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ج وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۚ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ (۹/۶۳)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! یہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کر لیں، حالانکہ اگر یہ واقعی مومن ہوتے، تو سمجھتے کہ اللہ اور اس کا رسول اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اسے اپنے ایمان و عمل سے راضی رکھیں۔ کیا (ابھی تک) انہوں نے یہ بات (بھی) نہ جانی کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے ہمیشہ اس میں جلے گا؟ اور یہ بہت ہی بڑی رسوائی ہے جو کسی انسان کے حصہ میں آ سکتی ہے۔)

مدینہ میں منافقین مسلمانوں کی کامیابی کی وجہ سے دولتمند ہو گئے، اس کے متعلق فرمایا کہ یہ دولت انہیں اللہ اور رسول نے دی ہے۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَ مَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ

یہ (منافقین) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں کہا، اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ضرور کفر کی بات کہی، وہ اسلام قبول کرکے پھر کفر کی چال چلے، اور اس بات کا منصوبہ باندھا جو نہ پا سکے، انہوں نے انتقام نہیں لیا، مگر اس بات کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں اپنے فضل سے (مال غنیمت دے دیکر) تونگر کر دیا ہے۔ بہرحال اگر یہ لوگ اب بھی باز آجائیں تو ان کے لئے بہتر ہے، اور اگر گردن موڑیں تو پھر یاد رکھیں اللہ ضرور انہیں دنیا اور آخرت میں عذاب دردناک دے گا۔ اور روئے زمین پر ان کا نہ کوئی کارساز ہونے والا ہے، نہ مددگار!

اور آگے بڑھیے (تجدید حافظہ کے لئے ایک بار اس حقیقت کو پھر سامنے لے آئیے کہ بیان یہ ہو رہا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ و رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد مرکز نظام حکومت ہے۔ اس باب میں بہت سے نظائر پہلے پیش کئے جا چکے ہیں، باقی آگے آتے ہیں) مال غنیمت کے متعلق فرمایا کہ

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ

اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ص وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۸ : ۱)

(اے پیغمبر اسلام!) لوگ تم سے پوچھتے ہیں۔ مالِ غنیمت کے بارے میں کیا ہونا

چاہیئے؟ کہدو، مالِ غنیمت درحل اللہ اور اس کے رسول کا ہے، پس اگر

تم مومن ہو تو، چاہیئے کہ (اس کی وجہ سے آپس میں جھگڑا نہ کرو) اللہ سے ڈرو

اپنا باہمی معاملہ درست رکھو، اور اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت میں

سرگرم ہو جاؤ۔

یہاں یہ بالکل واضح ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ حکومت ہے، چنانچہ

رسول اللہؐ کے زمانہ میں غزوات میں جس قدر مال غنیمت ہاتھ آیا وہ سب کا سب

ایک جگہ جمع ہو جاتا اور پھر حضور اس کی تقسیم فرماتے تھے، یعنی وہ مال افراد کی ملکیت

نہیں تھا، بلکہ حکومت کی ملکیت تھا۔ البتہ اس کی تقسیم کے لئے خدائی اصول مقرر

تھے، جن کا ذکر ذرا آگے چل کر ان الفاظ میں آتا ہے

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ

وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ

كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۸ : ۴۱)

اور جان رکھو، جو کچھ تمہیں مال غنیمت میں ملے، اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے رسول کے لئے (رسول کے) قرابت داروں کے لئے، یتیموں کے لئے مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے نکالنا چاہیئے۔ (اور بقیہ چار حصے مجاہدین میں تقسیم کردیئے جاسکتے ہیں)، اگر تم اللہ پر اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو، جو ہم نے فیصلہ کردینے والے دن اپنے بندے پر نازل کی تھی جبکہ دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو چاہیئے کہ اس تقسیم پر کاربند رہو، اور (یاد رکھو) اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں!

یہ خمس (پانچواں حصہ) اللہ اور رسول کے لئے تھا، اس خمس کی تفصیل مصارف سے ظاہر ہے کہ یہ حصہ بیت المال میں جائے گا، اور وہاں سے ان اجتماعی امور میں صرف ہوگا، جن کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد مسلمانوں کا امام ہے۔ اسی طرح مالِ فئے کے متعلق فرمایا۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵۹/۷)

(اور) جو کچھ اللہ اپنے رسول کو (اسی طرح) دوسری بستیوں سے دلوادے،

سو وہ (بھی) اللہ اور رسول کا حصہ ہے اور (رسول کے) قرابت داروں کا یتیموں، مسکینوں، اور مسافروں کا (حق ہے، یہ اس لئے) تاکہ وہ مال (فے) تمہارے تونگروں کے قبضہ میں نہ پہنچ جائے، اور اے مسلمانو! تم کو جو کچھ رسول (اپنی خوشی سے) دیدیا کرے اس کو لے لیا کرو، اور جس چیز کے لینے سے منع کر دیا کرے اُس سے رُکے رہا کرو، اور (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ (پاداش عمل میں) سخت عقوبت دینے والا ہے۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کا مطلب واضح ہے۔ اب سورۂ نسار کی اس آیت کی طرف آیئے

اولی الامر سے مراد

جس میں یہ نظام وضاحت سے بیان ہوا ہے (اور جس کے غلط مفہوم نے بدقسمتی سے ملت کو بہت سے مغالطوں میں الجھا رکھا ہے) ارشاد ہے

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۴۹)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی اطاعت کرو، جو تم میں صاحب حکم و اختیار ہوں، پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں باہم جھگڑ پڑو، (یعنی اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے) تو چاہیئے کہ اللہ

اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو، اور جو کچھ وہاں سے فیصلہ ملے اسے تسلیم

کرلو، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان (یقین) رکھتے ہو (تو تمہارے لئے

راہ عمل یہی ہے) اس میں تمہارے لئے بہتری ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی

ہے (کیونکہ اختلاف و نزاع کے اُبھرنے کا موقع نہیں رہتا، اور فتنوں فسادوں

کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔)

اس آیت مقدسہ میں عام طور پر اولی الامر سے مراد لئے جاتے ہیں، ارباب حکومت (مرکزی اور ماتحت سب کے سب) اور اس کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ اگر قوم کو حکومت سے اختلاف ہو جائے تو اس کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن (اللہ) اور حدیث (رسول) کو سامنے رکھ کر مناظرہ کیا جائے اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے خلاف ہو جائے۔ ذرا غور فرمائیے! دنیا میں کوئی نظام حکومت اس طرح سے قائم بھی رہ سکتا ہے کہ جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور جس کا جی چاہے اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے اور قرآن و احادیث کی کتابیں بغل میں دلب کر مناظرہ کا چیلنج دیدے! اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اس میں اللہ اور رسول سے مرکز ملّت (Central Authority) ہے اور اولوالامر سے مفہوم افسران ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کردو، امر متنازعہ فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کردو (اسے مرکزی حکومت کی طرف (Refer) کردو) مرکز کا فیصلہ سب

نکے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ یعنی اس نظام میں مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف عدالت عالیہ میں مرافعہ (اپیل) کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے۔ یہ کہ اولوالامر سے مراد مقامی حکام ہیں، اس سورۃ کی ایک دوسری آیت سے واضح ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۴/۸۳)

اور جب ان لوگوں کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے تو یہ (فوراً) اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں اگر یہ اسے (لوگوں میں پھیلانے کی جگہ) اللہ کے رسول کے اور اُن کے سامنے جو اُن میں صاحب حکم و اختیار ہیں پیش کرتے، جو بات کی تہ تک پہنچنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے (اور عوام میں تشویش نہ پھیلتی) اور (دیکھو) اگر اللہ کا تم پر فضل نہ ہوتا، اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تمہاری کمزوریوں کا یہ حال تھا کہ معدودے چند آدمیوں کے سوا سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

یعنی اگر اس قسم کا واقعہ مدینہ میں ظہور پذیر ہو تو اس کی اطلاع رسول اللہ کو دی جائے۔ اور اگر کہیں باہر ہو تو مقامی حکام کو اس سے مطلع کیا جائے۔

اللہ اور رسول کیلئے واحد کا صیغہ

قرآن کریم میں بعض آیات ایسی بھی ہیں۔ جن میں اللہ اور رسول کے الفاظ آئے ہیں، لیکن ان کے لئے صیغۂ واحد کا استعمال ہوا ہے، حالانکہ عربی کے عام قاعدے کی رو سے دو (اللہ اور رسول) کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہیئے۔ مثلاً

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ (۸)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اس سے روگردانی نہ کرو، اور تم (صدائے حق) سُن رہے ہو!

دیکھئے اس میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے لیکن وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ میں (عنہ) کی ضمیر واحد غائب کی ہے۔[1] اس سے ذرا آگے ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ج وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ وَاَنَّہٗۤ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (۸)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو، جب وہ

---

[1] اس آیت میں وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (جبکہ تم سن رہے ہو) کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں۔ عربی زبان میں اطاعت کے معنی ہی کسی زندہ کے احکام کی تابعداری ہے۔ اسلامی نظام میں اطاعت امام موجود کی ہوگی۔ جو قائم مقام ہوگا۔ خدا اور رسول۔ کا۔ یعنی مرکز نظام حکومت اسلامی۔

پکارتا ہے، تاکہ تمہیں (موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کر دے اور جان لو کہ (بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ) اللہ (اپنے ٹھیرائے ہوئے قانون و اسباب کے ذریعہ) انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، اور جان لو کہ (آخرکار) اسی کے حضور جمع کئے جاؤ گے!

اس میں بھی اللہ اور رسول کے الفاظ موجود ہیں لیکن اِذَا دَعَاکُمْ میں صیغہ واحد غائب کا ہے۔ سورۂ نور میں ہے

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ (۲۴ — ۴۹)

اور جب یہ (منافقین) اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ (ان کے امور متنازعہ فیہ) کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں سے ایک فریق پہلوتہی کر لیتا ہے۔

اور اگر ان کا کوئی حق (کسی پر) واجب ہو تو اس (مرکز ملت) کی طرف سر جھکاتے ہوئے چلے آتے ہیں۔

دیکھئے اللہ اور رسول کے الفاظ موجود ہیں لیکن یحکم میں صیغہ واحد کا ہے۔ اسی طرح یَاْتُوْٓا اِلَیْہِ میں ضمیر واحد غائب کی ہے۔ اس سے ذرا آگے ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ط وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ

فَقُلْ ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (۲۴/۵۴)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو کہ (اے مسلمانو!) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم (اطاعت سے) روگردانی کرنے لگ جاؤ تو سمجھ رکھو کہ رسول کے ذمہ وہ (تبلیغ و ارشاد) ہے جس کا اس پر بار رکھا گیا ہے اور تمہارے ذمہ وہ (اطاعت و انقیاد) ہے جس کا بوجھ تم پر عائد کیا گیا ہے اور اگر تم نے اس کی اطاعت کرلی تو (صحیح) راہ پر لگ جاؤ گے (بہر حال) رسول کے ذمہ صرف احکام کو صاف صاف طرح پہنچا دینا ہے (اور بس)

اس میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا مطالبہ ہے لیکن عَلَيْهِ اور تُطِيْعُوْهُ میں ضمائر غائب کی ہیں۔ ان مثالوں سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد، دو الگ، الگ، اطاعتیں نہیں ہیں بلکہ اللہ کی وہ اطاعت ہے جو مرکز نظام دین (حکومت خداوندی) کی وساطت سے ظہور میں آتی ہے۔ ان ضمائر میں واحد کے صیغے مرکز ملت کے لئے آئے ہیں جو اس وقت رسول اللہ کی ذات گرامی تھی۔ یہی وہ اطاعت ہے جس کے متعلق فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (۳۳/۳۶)

اور کسی مومن مرد و عورت کے لئے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول

کوئی فیصلہ صادر کر دے تو ان (مومنوں) کو اُس (فیصلہ کی تبدیلی) میں

کوئی اختیار باقی رہے، اور جو کوئی (با ایں ہمہ) اللہ اور اس کے رسول (کے

احکام) کی نافرمانی کرے گا تو (جان لو کہ) وہ کھلی ہوئی گمراہی کی چال چل گیا۔

اگر یہ اطاعت نہیں تو ایمان کا زبانی دعویٰ کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ

مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ (۲۴/۴۷)

اور یہ (منافقین) لوگ (زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر

یقین (ایمان) رکھتے ہیں اور ہم (دل سے) اطاعت کرتے ہیں۔ پھر ایسا ہوتا

ہے کہ ان میں کا ایک گروہ اس کے بعد (خدا اور رسول کے حکم سے) سرتابی

کر بیٹھتا ہے اور یہ لوگ سچ تو یہ ہے کہ ایمان ہی نہیں رکھتے۔

ان ہی قوانین کا نام حدود اللہ ہے جن کی اطاعت ضروری ہے۔

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ

الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ (۴/۱۳)

(یاد رکھو) یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیاں ہیں، پس جو کوئی اللہ اور

اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا، تو اللہ اُسے (ابدی راحتوں کے) ایسے

باغوں میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی (اور اس نے

اُن کی شادابی کبھی متغیر ہونے والی نہیں، وہ (سرور و راحت کی) اس حالت میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی ہی کامیابی ہے جو انہیں حاصل ہو گی!

اور جن کی معصیت سے جہنم لازمی ہے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (۴ پ ۴ ۲۳)

لیکن جس کسی نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں سے باہر نکل گیا، تو (یاد رہے) وہ جنت کی ابدی راحتوں کی جگہ) آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا۔ وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا۔ اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا

یہ اطاعت ایک امانت ہے، جس میں خیانت کبھی نہیں کی جا سکتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۸ / ۲۷)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! ایسا نہ کرو، کہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کرو، اور نہ یہ کہ آپس کی امانتوں میں خیانت کرو، اور تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو۔

صرف اتنا ہی نہیں کہ احکام نافذ ہونے کے بعد ان کی اطاعت کی جائے بلکہ یہ بھی کہ کسی معاملہ میں مرکز کے فیصلہ کے انتظار کئے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۴۹/۱)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) سے پہلے (کسی معاملہ میں) سبقت نہ کیا کرو، اور اللہ سے (ہر حال) میں ڈرتے رہو۔ بلا شبہ اللہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ (۴۹/۲)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم اپنی آوازیں نبی کی آواز پر بلند مت کیا کرو اور نہ اس سے اس طرح چلا چلا کر بولا کرو۔ جس طرح باہم گربولتے ہو، کبھی تمہاری لاعلمی میں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں۔

یہی مرکز ملت کا محافظ و نگراں ہے، اور اس کے تمام مفاد کا بہترین امین

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۝ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ۝ (۵/۵۵—۵۶)

(مسلمانو!) تمہارا رفیق و مددگار تو بس اللہ ہے، اس کا رسول ہے اور وہ

لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں۔ جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ نماز قائم رکھتے ہیں

زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور (ہر حال میں) اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

اور (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کو، اس کے رسول کو، اور ایمان والوں کو، اپنا

رفیق و مددگار بنایا تو وہ اللہ کے گروہ میں سے ہے، (اور) بلاشبہ اللہ ہی کا گروہ

غالب رہنے والا ہے!

رسول اور قرآن کی اطاعت

بعض مقامات پر اللہ اور رسول کے الفاظ کی بجائے قرآن اور رسول کے الفاظ بھی آئے ہیں جن کا مفہوم بھی وہی ہے، یعنی مرکز ملت جو قرآنی احکام کو نافذ کرے۔ غور فرمایئے، پہلے یہ ارشاد ہے کہ

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ

وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ

وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ

يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ (۴/۶۰)

(اے پیغمبر اسلام!) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی؟ (یعنی منافقوں

کی حالت پر) ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے، اور جو کچھ تم سے

پہلے نازل ہو چکا ہے، وہ اس پر یقین (ایمان) رکھتے ہیں۔ لیکن (عمل کا حال

یہ ہے کہ چاہتے ہیں، اپنے جھگڑے قضیئے غیر خدائی طاقتوں کے سامنے لیجائیں حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اُس سے انکار کریں، اور صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کی پیروی کریں)، اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انہیں اس طرح گمراہ کر دے کہ راہ راست سے دور جا پڑیں!

اور اس کے بعد

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ۝ (۴/۶۱)

اور (اے پیغمبر اسلام!) جب ان لوگوں کو اللہ کے حکم کی طرف جو اس نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو، تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تم سے روگردانی کرتے ہیں اور ان کے قدم ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ (۵/۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (عقل و بصیرت کی) اس بات کی طرف آؤ، جو اللہ نے نازل کی ہے اور اللہ کے رسول کی طرف رجوع کرو، تو کہتے ہیں۔ ہمارے لئے تو وہی طریقہ بس کرتا ہے جس میں ہم نے اپنے باپ دادوں کو

چلتے دیکھا ہے " (ان سے پوچھو کہ) اگران کے باپ دادا کچھ جانتے بوجھتے نہ ہوں، اور راہ راست پر بھی نہ ہوں (تو کیا پھر بھی وہ ان ہی کی اندھی تقلید کرتے رہیں گے)

ظاہر ہے کہ ان مقامات میں مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (قرآن) اور رسول کی طرف الگ الگ دعوت نہیں ہے، اس لئے کہ الگ الگ دعوت کے کچھ معنی ہی نہیں۔ ان کفار و منافقین کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی جاتی تھی، اور وہ دعوت اسلام کے نظام کی تھی۔

اطاعت مرکز کی ہے

ان تصریحات سے واضح ہے کہ نظام قرآنی میں اطاعت مرکز ملت کی ہے اور چونکہ یہ مرکز قوانین خداوندی کی تنفیذ کرتا ہے اور سب سے پہلا مرکز رسول اکرمؐ کی ذات گرامی تھی اس لئے قرآن کریم میں مرکز ملت کو "اللہ اور رسول" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے بمرحلہ بالا مقامات کے علاوہ حسب ذیل آیات میں بھی "اللہ اور رسول" (یعنی مرکز نظام ملت) کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۳/۳۲)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو۔ فلاح و سعادت کی راہ تمہارے لئے ایک ہی

اور وہ یہ ہے کہ) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو (اطاعت الٰہی سے روگرداں ہونا شیوۂ کفر ہے۔ اور) اللہ کفر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا!

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ (۴/۶۹)

اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جن پر خدا نے انعام کیا ہے۔ اور وہ نبی ہیں۔ صدیق ہیں۔ شہید ہیں۔ اور (تمام) نیک اور راست باز انسان ہیں۔ (اور جس کسی کے رفیق ایسے لوگ ہوں تو) ایسے رفیق کیا ہی اچھے رفیق ہیں!

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (۵/۹۲)

اور (دیکھو) اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، اور (برائیوں سے) بچتے رہو، پھر اگر تم نے روگردانی کی تو جان رکھو، ہمارے پیغام بر پر تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے (عمل کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے، اور جیسا تمہارا عمل ہوگا، ویسا ہی نتیجہ بھی پاؤ گے۔)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا

عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ (۲۸/۱۲)

اور (دیکھو) اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان رکھو) ہمارے پیغامبر پر تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے (عمل کرنا، یا نہ کرنا تمہارا کام ہے، اور جیسا تمہارا عمل ہوگا ویسا ہی نتیجہ بھی پاؤ گے۔)

یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا ۝ (۲۲/۷۱)

اللہ تمہارے اعمال میں درستی پیدا کرے گا، اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ اور جو کوئی اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اطاعت (فرماں برداری) کرے گا تو وہ بہت ہی بڑی فیروزمندی کو پہنچیگا۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ ۝ (۲۶/۳۳)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور کفر و نافرمانی کر کے اپنے اعمال مت بگاڑو

لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ ط وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ج وَمَنْ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبْہُ

عَذَابًا اَلِيْمًا ۔ (۴۸ / ۱۷)

(ہاں البتہ) اندھے پر، اور لنگڑے پر اور مریض پر کوئی گناہ نہیں اور جس کسی نے اللہ کی اطاعت کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اللہ (جزائے عمل میں) اس کو (ابدی راحتوں کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی (جن کی وجہ سے ان کی شادابی میں تغیر نہیں ہوگا) اور جو کوئی (اطاعت سے) روگردانی کرے گا تو اس کو (پاداش عمل میں) دردناک عذاب کی سزا دے گا۔

یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں اللہ یا قرآن یا رسول کی اطاعت کا الگ بھی ذکر ہے اس سے بھی اسی قسم کی اطاعت مقصود ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یعنی نظام دین (مرکز حکومت خداوندی) کی اطاعت؛ اس لئے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی نہیں کی جا سکتی اور قرآن کے متعین فرمودہ نظام اجتماعی کے پیش نظر انفرادی طور پر اطاعت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ رسول سب سے پہلا مرکز نظام ملت ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی اطاعت، مستقل اطاعت نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے قوانین کی اطاعت ہوتی ہے، اسی لئے فرمایا۔

قرآنی فیصلے

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۴ / ۶۴)

اور (اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں کو جو تمہاری اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو ان ہی کے ساتھ ہوئی ہو۔) ہم نے جس کو بھی منصب رسالت دیکر دنیا میں کھڑا کیا۔ تو اسی لئے کیا، کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور جب ان لوگوں نے تمہاری نافرمانی کرکے) اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیا تھا۔ تو اگر اسی وقت تمہارے پاس حاضر ہو جاتے۔ اور خدا سے (اپنی نافرمانی کی معافی مانگتے نیز خدا کا رسول بھی ان کی بخشش کے لئے دعا کرتا، تو یہ لوگ دیکھ لیتے کہ خدا بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور (ہر حال میں) رحمت رکھنے والا ہے!

اسی اطاعت کا حکم اس سے اگلی آیت میں مسلمانوں کے لئے ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (۶۵/۴)

پس (دیکھو) تمہارا پروردگار اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک ایسا نہ کریں کہ اپنے تمام جھگڑوں، قضیوں میں تمہیں حکم بنائیں، اور پھر (صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ) ان کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو، اس کے خلاف کسی طرح دل گرفتگی محسوس نہ کریں، اور وہ جو کسی بات کو پوری طرح مان لینا ہوتا ہے، اسی

طرح ٹھیک ٹھیک، مان لیں۔

اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ رسول کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام فیصلے قرآن کی رو سے کرے، کہ حکم قرآن ہی کا ہو گا کسی اور کا نہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ؑ (۱۳/۳۷)

اور اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے اسے (یعنی قرآن کو) ایک عربی فرمان کی شکل میں اتارا، اگر حصولِ علم کے بعد تو نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، تو سمجھ لے کہ پھر اللہ کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی کارساز ہو گا نہ بچانے والا۔

اسی اطاعت سے خدا کی محبت حاصل ہوتی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؕ (۳/۳۱)

(اے پیغمبرِ اسلام!) ان لوگوں سے کہدو، اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو تمہیں چاہیئے کہ میری پیروی کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اور تمہاری خطائیں بخشدے گا۔ وہ بڑا ہی بخشدینے والا اور رحمت رکھنے والا ہے!

اور یہی وہ صراط مستقیم ہے جو انسان کو اس کے ارتقائی منازل کی انتہا تک پہنچاتی ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۶/۱۵۴)

اور اس نے بتلایا کہ یہی راہ میری (ٹھیرائی ہوئی) سیدھی راہ ہے، سو اسی پر چلو، اور دوسری راہوں پر نہ چلو، کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمہیں تتر بتر کر دیں۔ یہ بات ہے جس کا خدا نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم (نظام خداوندی کی) ضمانت میں آجاؤ۔

اس لئے رسول کا حق سب سے اولیٰ ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤى اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ (۳۳/۶)

نبی مومنوں کے خود اپنے نفس سے بھی زیادہ حقدار ہے اور اس کی بیبیاں ان (تمام مسلمانوں کی) مائیں ہیں، اور اللہ کی کتاب (کے قانون) میں رشتہ دار بہ نسبت دوسرے مومنین و مہاجرین کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ

(میراث کا) زیادہ حق رکھتے ہیں مگر یہ جائز ہے کہ اگر تم اپنے دوستوں سے (بطور وصیت کے) کچھ سلوک کرنا چاہو تو کر سکتے ہو) یہ بات قانونی نوشتہ میں لکھی جا چکی ہے۔

اس لئے کہ مومنین کا جان اور مال اللہ نے خرید رکھا ہے (سورہ توبہ) اور اس بیع و شریٰ سے مفہوم ہی یہی ہے کہ وہ نظام دین کے استحکام و استقلال میں کام آئے چنانچہ اس کی تفسیر سورۂ توبہ کی اس آیت میں موجود ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؀ (۹/۲۴)

اُن سے کہدو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور مال جسے تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کے خسارے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں، تمہارے نزدیک اللہ اور رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو ذرا ٹھیرو یہاں تک کہ اللہ (کا قانونِ مکافاتِ عمل اس) کا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت کی راہ نہیں دکھایا کرتا۔

یہاں دیکھئے پھر وہی "اللہ اور رسول" کے الفاظ موجود ہیں۔ اور "جہاد فی سبیل اللہ" کے الفاظ اس غایت کی وضاحت کر رہے ہیں، جس کے لئے جماعت کے نزدیک یہ مرکز ہر عزیز ترین متاع سے بھی عزیز تر ہونا چاہیئے اس لئے کہ

ملّت کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو، خودی کیا ہے خدائی

قرآن کریم کی ان نصوص صریحہ سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی کہ "اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد مرکزِ حکومتِ قرآن کی اطاعت ہے۔ وہ مرکز جو خدا کے احکام کا نافذ کرنے والا اور رسول اللہ کی امامتِ کبریٰ کو آگے چلانے والا ہوگا۔ اس اعتبار سے یہ مرکز "خدا اور رسول" کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اسی کے ذمہ، قرآنی اصولوں کی جزئیات کا تعین اور انہیں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا فریضہ ہوگا۔ یہی افسرانِ ماتحت (اولوالامر) مقرر کرے گا اور اگر ان صاحبانِ امر کے کسی فیصلہ سے ملّت کو اختلاف ہوگا تو اس کا تصفیہ بھی اسی مرکز کی طرف سے ہوگا۔ اس نظام میں ملّت کے اربابِ علم و نظر کو حریتِ فکر اور آزادیٔ اجتہاد حاصل ہوگی لیکن ان کی تحقیق و اجتہاد کے نتائج اسی وقت واجب الاطاعت ہوں گے۔ جب وہ مرکز کی طرف سے بطور قانون نافذ ہوں گے۔ نہ انفرادی فتاویٰ کی کوئی حیثیت ہوگی، نہ الگ الگ واعظوں کی ضرورت۔

مولویوں اور عالموں کا کوئی جداگانہ گروہ نہیں ہوگا (جس طرح قرن اول میں ان کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا تھا، جو شخص اہلیت رکھے گا، نظامِ حکومت کا جزو بن جائے گا۔ نظامِ حکومت چلانے والی جماعت کے سامنے قرآن ہوگا اور بطور مؤیدات احادیث ہوں گی، کتب سیر و تاریخ و آثار ہوں گی۔ ائمہ فقہ کے اجتہادات ہوں گے خود اپنے زمانہ کے ارباب فہم و فراست کی تحقیقات کے نتائج ہوں گے۔ اس تمام سرمایۂ علم و فکر کی روشنی میں، وہ اپنے زمانہ کے مقتضیات کے مطابق مسائل پیش نظر کے حل کے لئے قرآنی اصولوں کے جزئی قوانین مرتب کریں گے، اس کا نام شریعت اسلامی ہوگا۔

یہ حصہ صرف ترتیب: تدوینِ قوانین کا ہے لیکن یہ قوانین کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو اسلامی نظام کا ماحصل ہیں جب تک ان کے نافذ کرنے والوں کی سیرت میں وہ تبدیلی نہیں پیدا ہو جائے گی جو قرآن چاہتا ہے۔ ہماری تاریخ میں اکثر ابواب ایسے ہیں جن میں مسلمان بادشاہوں نے وہی قوانین رائج کئے، جنہیں ہم قانونِ شریعت کہتے ہیں (اور آج بھی کئی ایک اسلامی ممالک میں قوانین شریعت رائج ہیں) لیکن بایں ہمہ، ان کی سلطنتیں نوعِ انسانی کے لئے کبھی موجبِ رحمت نہ بن سکیں۔ ان قوانین نے اپنے صحیح اور مکمل نتائج اس وقت پیدا کئے تھے، جب یہ دنیا میں محمد رسول اللہ والذین معہ کے مقدس ہاتھوں سے نافذ ہوئے تھے۔ اس لئے یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا نظام وہی نتائج پیدا کر رہا ہے

یا نہیں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری سیرت، سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھل رہی ہے یا نہیں۔ سیرتِ محمدیہ معراجِ انسانیت ہے۔ اور اس کی اصلی تصویر قرآن کے صفحات میں محفوظ ہے

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اسلامی نظام

(علامہ اسلم جیراج پوری)

[موضوع پیش نظر پر علامہ اسلم جیراج پوری مدظلہٗ کا بھی ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس مضمون میں اکثر و بیشتر باتیں وہی ہیں جو سابقہ عنوانات میں سامنے آچکی ہیں۔ لیکن اس میں چند ایک تصریحات ایسی بھی ہیں جو مسئلہ زیرِ غور کی مزید تشریح و تفسیر میں ممد و معاون ثابت ہوں گی۔ بالخصوص وہ سوالات و جوابات جو اس مضمون کے آخر میں دیئے گئے ہیں اس مقصد کے پیش نظر مناسب سمجھا گیا کہ اس سلسلہ میں اس مضمون کو بھی شامل کر لیا جائے۔ اس مضمون میں جن باتوں کی تکرار ہو گئی ہے اُن سے قندِ مکرر کا فائدہ حاصل ہو گا]

قرآن کریم نے ملتِ اسلامیہ کا نظام وحدتِ اطاعت پر رکھا ہے یعنی اس کو سوائے اللہ کے کسی دوسرے کا مطیع نہیں بنایا:۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ

الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰)

کسی کا فرمان نہیں سوائے اللہ کے اُس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے

کسی کے بندے نہ بنو، یہی ہے سیدھا دین مگر اکثر آدمی نہیں جانتے۔

وہی بلا شرکت غیرے اصلی حاکم اور مطاع ہے۔

وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۲۵)

اور اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

اُس نے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایت اور اُن کی عقلوں کو صحیح راستہ پر لگانے اور اپنی رضامندی اور نارضامندی کے اعمال کو واضح کرنے کے لیے ایک ناقابل تغیر و تبدل کتاب اور مکمل دستور العمل قرآن کریم کو اتار دیا تاکہ اس کے مطابق عمل کرکے لوگ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دنیا جہان کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔

وَهٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَکٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّکُمْ

تُرْحَمُوْنَ (۶/۱۵۵)

اور یہ کتاب جس کو ہم نے اتارا ہے مبارک ہے اس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری

اختیار کرو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

اللہ کی اطاعت کے معنی یہی ہیں کہ اُس کی کتاب کی پیروی کی جائے۔

اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ

اَلْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۴)

کیا اللہ کے سوا میں کسی اور کو حاکم بناؤں، حالانکہ اللہ تو وہ ہے جس نے

تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری ہے۔

اس کتاب کے سوا کسی دوسرے کی پیروی ممنوع ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا

مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)

اسی کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے

اور اس کے سوا دوسرے آقاؤں کی پیروی نہ کرو!

چنانچہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ

سمجھ رکھی ہے وہ قیامت میں جب نتیجہ برعکس دیکھیں گے تو چلا کر کہیں گے۔

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۠

رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا

(۳۳/۶۷)

رسالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔

(۱) پیغمبری۔ یعنی پیغام الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست

پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا

گیا۔

(۲) امامت۔ یعنی امت کا انتظام، اس کی شیرازہ بندی، ان کے باہمی

قضایا کے فیصلے۔ تدبیر، مہمات، جنگ و صلح وغیرہ اجتماعی امور میں اُن کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔

پہلی حیثیت یعنی پیغمبری کے لحاظ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے آپ کے ذمہ لازم کر دیا گیا تھا۔

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (۵/۶۷)

اے رسول جو تجھ پر اُتارا گیا ہے اُس کو پہنچا دے اور اگر تو نے نہ کیا تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی!

لیکن بحیثیت امام لوگوں سے مشورہ لینے کے لئے مامور تھے۔

وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۱۵۹)

اور امور حکومت میں اُن سے مشورہ لیا کرو۔

یہ امامت کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی و صلاح فلاح کے لئے قائم ہوئی قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ ہمیشہ رہنی چاہیئے۔ قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے دیئے ہیں وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لئے ہیں جس میں آپ کے خلفاء بھی داخل ہیں۔

یہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

وَمَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ (ن ۴)

اور جو رسول کی اطاعت کرے گا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

خلفائے رسول کی اطاعت بھی اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت ہے۔ چنانچہ مرکز کے لئے یہی لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (۸)

اے مومنو! اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور اس سے منہ نہ موڑو

جس حال میں کہ تم سن رہے ہو۔

اس آیت میں عَنْهُ کی ضمیر مفرد ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ "اللہ و رسول" دونوں سے ایک ہی شئے مراد ہے۔ یعنی مرکز۔ ورنہ قاعدہ کے مطابق یہاں "عنهما" ہونا چاہیئے تھا، اور "جس حال میں کہ تم سن رہے ہو" کی قید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اطاعت بالمشافہہ ہے اور عربی میں اطاعت کے معنی ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸)

اے مومنو! اللہ و رسول کی بات مانو جب وہ تم کو ایسے کام کے لئے بلائے جس میں تمہاری زندگی ہو۔

یہاں بھی دعا کا صیغہ مفرد ہی اللہ و رسول دونوں کے لیے مستعمل ہوا ہے اور یہ حکم بھی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے جو آپ کے تمام آنے والے خلفار پر مشتمل ہے

جنگ اُحد میں ہزیمت اُٹھانے کے بعد دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ غنیم کے تعاقب میں نکلیں۔ یہ حکم چونکہ بحیثیت امام کے تھا اس لئے قرآن میں "اللہ و رسول" دونوں کا حکم کہا گیا۔

الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (۳-۱۷۲)

جنہوں نے حکم مانا اللہ و رسول کا اپنے زخم اٹھانے کے بعد

اسی طرح حج اکبر کے دن مشرکوں سے برأت کا اعلان جو مرکزِ اسلام کی طرف سے ہوا وہ "اللہ و رسول" دونوں کے نام سے ہوا۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ

اور اعلان ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری ہے

باغیوں اور ڈاکوؤں کو جو مرکز کے مجرم ہیں، "اللہ و رسول" دونوں کا محارب قرار دیا گیا۔

إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۔ (۳۳/۵)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور روئے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اُن کی سزا بس یہی ہے کہ مار ڈالے جائیں۔ الخ

ان مجرموں کی یہی سزا ہمیشہ کے لئے ہے کچھ عہد رسالت ہی تک محدود نہ تھی۔

الغرض بیسیوں آیات ہیں جن میں "اللہ و رسول" کا لفظ مرکز کے معنی میں مستعمل ہوا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

دستور العمل جس طرح اُمتِ اسلامیہ کی انفرادی زندگی کی اصلاح کے لئے قرآن اتارا گیا ہے اسی طرح اس کی اجتماعی زندگی کا بھی دستور العمل وہی ہے۔ وہ ایسی کامل کتاب ہے کہ ہر زمان و مکان اور ہر ماحول میں افراد کی ہدایت اور ملت کی رہنمائی کے لئے کافی ہے، اسی لئے جہاں ہر شخص کو ہدایت کی گئی ہے کہ قرآن کی پیروی کرے وہاں مرکز کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ قرآن ہی کے مطابق لوگوں کے درمیان حکومت کرے:

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَاكَ اللّٰهُ (۱۰۵/۴)

ہم نے تیرے اوپر حق کے ساتھ کتاب اُتاری ہے کہ جو کچھ اللہ تجھ کو سمجھائے

اُس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کر۔

قرآن کے سوا کسی دوسرے کی طرف رُخ کرنے کی ممانعت کی گئی۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۹)

اور اُن کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس حق کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل

شدید تاکید کی گئی کہ مرکز کو قرآنی تعلیمات سے ذرا بھی غفلت روا نہیں ہے اور نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اُس پرکار بند رہنا چاہیئے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ (۵/۴۹)

اور یہ کہ تو فیصلے کر اُن کے درمیان اسی کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور اُن کی خواہشوں کے پیچھے نہ جا۔ اور احتیاط رکھ کہ اللہ کے اُتارے ہوئے کسی حکم سے وہ تجھ کو بہکا کر فتنہ میں نہ ڈال دیں!

یہاں تک کہ یہ وعید بھی کی گئی

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۵/۴۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے کے مُطابق حکم نہ دیں گے وہ فاسق ہیں۔

فریضۂ اُمّت | اسلام کے معنے ہی اطاعت کے ہیں۔ اُمّتِ اسلامیہ کو یہی

حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ و رسول یعنی مرکز کی مطیع رہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا

کہہ دے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اگر تم روگردانی کروگے تو اس کی ذمہ داری اُس کے اوپر ہے اور تمہاری ذمہ داری تمہارے اوپر ہے اور جو تم اُس کی اطاعت کروگے تو سیدھے راستے پر رہوگے

مرکز کے وفادار رہو اور اُس سے غدّاری اور مفوضہ فریضہ میں خیانت کاری نہ کرو۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۸)

اے مومنو! اللہ و رسول سے غداری اور جانتے ہوئے اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو

مرکز ہی کی اطاعت کامیابی کا ذریعہ ہے

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۲۴/۵۱)

• مومنوں کا قول جب وہ اللہ و رسول کی طرف بلائے جائیں کہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے بس یہی ہے کہ کہہ دیں کہ ہم نے سُنا اور مان لیا۔ اور یہی لوگ

فلاح پانے والے ہیں۔

مرکز کے احکام سے سرتابی کرنے والے سب سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ (۵۸)

جو لوگ اللہ اور رسول سے مخالفت کریں گے وہ سب سے زیادہ ذلیل لوگوں میں سے ہوں گے۔

مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مرافعہ ہے۔

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ (۳۶/۳۳)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو اپنے معاملہ میں اختیار باقی نہیں رہتا۔ جبکہ اللہ و رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے۔

یعنی مرکز ہر دینی یا دنیادی امر میں آخری اور بالاترین اختیار ہے۔ جس کی اطاعت کے سوا مسلم کے لئے کوئی چارہ نہیں اور جس کی نافرمانی گمراہی ہے۔

اطاعت

یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن سوائے اللہ کے کسی دوسرے کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا یہاں تک کہ والدین کا بھی جہاں جہاں ذکر کیا ہے اُن کے ساتھ سلوک اور احسان ہی کی وصیت فرمائی

ہے، اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے دینی اطاعت خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، صرف اکیلے اللہ کی ہے۔ انفرادی لحاظ سے قرآن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ جب تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت میں موجود تھے اُن کی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی اور آپ کے بعد اس امامت کبریٰ پر آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے جن کا فریضہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی کے مطابق احکام نافذ کریں اور اُمت کے منتخبہ افراد کو مشاورت کے لئے ساتھ رکھیں یہ احکام قطعی اور حتمی ہوں گے جن سے سرتابی کرنے والا اللہ و رسول کا دشمن ہوگا۔

الغرض دینِ اسلام محض ایک کتابی مذہب نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک مکمل عملی نظام ہے جو بدقسمتی سے مدتہائے دراز سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے کھو گیا ہے اور اسی باعث سے وہ غارت ہوئے ہیں کیونکہ کسی ملت کی زندگی جب تک کہ اُس کا زندہ مرکز نہ ہو سخت دشوار ہے۔

اجتماعی نظام کی پوری شکل اس آیت میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (۴ / ۵۹)

اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اور تم میں سے جو اُمراء ہوں

اُن کی اطاعت کرو۔ اگر کسی بات میں تم تنازع کر بیٹھو تو اس کو اللہ و

رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی اصل مطاع اللہ ہے۔ اس کی اجتماعی اطاعت ہو گی، رسول یعنی مرکز یا مرکز کے مقرر کئے ہوئے اور اختیار دیئے ہوئے مسلم امراء کے ذریعہ سے۔ اُن امراء کا کوئی فیصلہ یا حکم اگر مسلمانوں کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو اُس میں اُن کو امراء کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے۔ اس قسم کے نزاعی امور میں مرکز کی طرف رجوع کرنا ہو گا، جو اُن کا فوراً قطعی فیصلہ کر دے گا۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ملت کا سارا اجتماعی اختیار مرکز کے ہاتھ میں ہے اُسی کی طرف سے ہر شعبہ کے امراء کا تقرر ہو گا، مثلاً اُمراء ملک، اُمراءِ فوج، اُمراء عدل، امراء حج۔ وائمہ صلوٰۃ و تعلیم و ارشاد وغیرہ نیز اس کا یہ بھی فریضہ ہو گا کہ افراد ملت اور امراء ملت کے تنازعات کو مٹاتا رہے اور ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف و افتراق پیدا نہ ہونے دے، اس انتظامی سلسلہ سے اُمت کا کوئی فرد باہر نہیں نکل سکتا۔

اس نظام میں ارباب علم و عقل کو فکر کی پوری حُریت اور اجتہاد کی مکمل آزادی کے علاوہ قرآن نے درجاتِ عالیہ کی سربلندی بھی عطا کی ہے۔ لیکن ان کو مطاع یا متبوع نہیں قرار دیا ہے، اُن کی تحقیق و اجتہاد کے نتائج اُمت کے لئے اُسی وقت حجت ہوں گے۔ جب مرکز سے مسلّم ہو کر اس کو ملیں گے۔ اسی طرح اولو

کو وعظ اور مرشدوں کو رہنمائی کی اسی وقت اجازت ہوگی جب وہ مرکز کا پروانہ رکھتے ہوں گے۔

آخر میں پھر تصریح کر دیتا ہوں کہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں مرکز کو اللہ و رسول کہتا ہوں، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز ہی کی اطاعت کو قرآن، اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتا ہے، بشرطیکہ مرکز قرآن کے مطابق ہو۔

میں قرآن کی تشریح کا خود قرآن ہی سے قائل ہوں، اسی بنا پر اللہ و رسول کا یہ مفہوم کہ اُس سے مراد مرکز یعنی امام وقت ہے، چند آیات ہی سے واضح کیا ہے جو اہلِ بصیرت کے لئے کافی ہیں۔ اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو اور بھی متعدد آیات سے تفصیل پیش کرنے کی گنجائش ہے، مگر عام اہلِ اسلام قرآنی الفاظ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال کی بھی سند چاہتے ہیں اور مدتہائے دراز سے اس کے خوگر ہو رہے ہیں اس لئے اُن کی تسکینِ خاطر کے واسطے چند ائمۂ تفسیر کے اقوال بھی نقل کئے دیتا ہوں جنہوں نے اللہ و رسول کے معنی امام وقت ہی کے لکھے ہیں۔

امام ابن جریر طبری سورۂ انفال کی پہلی آیت میں قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں۔

واولی هذه الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال هی زیادات یزیدها الامام لبعض الجیش او جمیعهم

انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے۔

یہاں انفال کے معنی سے مجھے بحث نہیں مدعا صرف یہ ہے کہ اللہ و رسول کی تفسیر انہوں نے امام وقت لکھی ہے۔

امام رازی نے آیت ۳۳/۵ اِنَّمَا جزآءُ الذین یحاربون اللہ و رسولہ کے تحت میں امام ابو حنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

قال ابو حنیفۃ اذا قتل واخذ المال فالامام مخیّرٌ فیہ بین ثلاثۃ اشیاء

امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل قطع اور صلب) میں سے جو سزا چاہے اس کو دے۔

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں۔

عن سعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیّر فی المحارب یصنع بہ ما یشاء

سعید بن مسیب، حسن بصری اور ضحاک نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں

امام کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

یہی امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے اور فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:-

قال ابن عباس وسعید بن المسیب ومجاھد وعطاء والحسن البصری وابراھیم النخعی والضحاك وابو ثور من شھر السلاح فی قبة الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر به وقدر علیه فامام المسلمین فیه بالخیار

حضرت ابن عباس۔ سعید بن المسیب مجاہد، عطار حسن بصری، ابراہیم نخعی ضحاک اور ابو ثور نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اُٹھایا اور رستوں کو پرُخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے (جو سزا چاہے دے)

ان اقوال سے دو باتیں ظاہر ہو گئیں ایک تو یہ کہ اللہ و رسول سے مراد امام وقت ہے اور دوسری یہ کہ یہ احکام آنحضرت صلعم کی ذات یا زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ دائمی ہیں اور یہی دونوں باتیں ہیں نے آیات سے واضح کی ہیں۔

تکملہ اس مضمون کے متعلق بعض لوگوں نے زبانی اور بعض لوگوں نے بذریعہ تحریر مختلف قسم کے سوالات کئے۔ جن سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ توضیح طلب ہے اس لئے

ضروری معلوم ہوا کہ اُن میں سے معقول سوالات کو چن کر ترتیب کے ساتھ معہ اُن کے جوابات کے لکھوں تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو جائے۔

(۱)

س۔ تم کہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں ایک پیغمبری جس کے ذریعہ سے قرآن ملا۔ دوسری امامت یعنی ملت کی مرکزیت جو آپ کی ذات سے قایم ہوئی۔ اتباع قرآن کی شرعی حیثیت مسلم ہے مگر مرکز تو ایک دنیاوی ادارہ ہے۔ اگر نہ ہو، جیسا کہ آجکل ہے، تو اس سے مسلمانوں کے اسلام میں کیا خرابی آتی ہے۔

ج۔ بلا مرکز کے ملت کے مقاصد متعین نہیں ہوتے اور نہ اس میں اجتماعی عمل صالح کی حرکت پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ بیابان کے ریگ کے ذرّوں کی طرح منتشر رہتی ہے جو ہر ہوا اور آندھی کے ساتھ جدھر کی بھی ہو اُڑتی رہتی ہے۔ قرآن اُمت کا ایمان ہے اور مرکز اس کا اجتماعی عمل۔

قرآن میں اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت کے احکام جو مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں، وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مرکز کی حیثیت بھی شرعی ہے اور وہ محض دنیاوی ادارہ نہیں ہے، ملت امام کے بغیر ایسی ہی ہے جیسے جسم سر کے بغیر جس کا انجام ہلاکت ہے

(۲)

س۔ اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت بلا مرکز کے بھی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ قرآن و سنت اور علماء کی اطاعت کی جائے جیسی کہ آجکل ہم کر رہے ہیں۔

ج۔ اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں کہ باوجود اپنی کثرت تعداد کے اور باوجود عالم میں اپنی زبردست جغرافی حیثیت کے اور باوجود اس کے کہ اسلام میں تمام تر بہادر اور جنگ آور قومیں داخل ہیں جن کے پس پشت عظیم الشان تاریخیں ہیں پھر بھی دوسروں سے کمزور اور ذلیل و خوار ہیں بلکہ امت کا بیشتر حصہ شرک اور کفر کا محکوم اور غلام ہے جو اسلام کا جزء صالح نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نتیجہ ہے زندہ مرکز نہ ہونے کا۔ اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے قرآن و حدیث کو لے لیا کہ جس طرح چاہیں اُن پر عمل کریں یا نہ بھی عمل کریں، تو اطاعت کا مطالبہ کرنے والا کون ہے۔ رہے علماء تو اُن کا حلقہ اثر محدود ہوتا ہے جس سے مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ علاوہ بریں وہ خود اکثر آپس کی مخالفتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں مبتلا رہتے ہیں اور امت میں اور زیادہ تفریق و انتشار کا موجب ہوتے ہیں۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے جو ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں امت کو اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔

(۳)

س۔ تم نے اللہ و رسول کا مفہوم امام وقت ثابت کیا ہے لیکن علماء اس کے

معنی کتاب وسنت کے سمجھتے ہیں کیا اللہ کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ان دو لفظوں کے بجائے صرف ایک لفظ امام کہہ دیتا تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

ج ۔ قرآنی الفاظ مقصود کے مطابق ہوتے ہیں ۔ صرف امام کا لفظ کہنے سے اسلامی مرکز کا صحیح مفہوم نہیں ادا ہو سکتا تھا کیونکہ امام کہتے ہیں پیشرو اور رہبر کو خواہ کسی قسم کا ہو ۔ لغوی معنی کے لحاظ سے آج ہٹلر[1] بھی جرمن قوم کا امام ہے ۔ لیکن اللہ کو بیان کرنا مقصود ہے اس امام کا جو قرآنی احکام کو نافذ کرنے والا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امامت کا چلانے والا ہو ۔ یہ مفہوم صرف اللہ ورسول ہی کے لفظ سے ادا ہو سکتا تھا ۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسی کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے ۔

(۴)

س ۔ پھر بھی یہ بات حل طلب رہی کہ علماء نے اللہ ورسول سے مرکز ملت کیوں نہ سمجھا ۔

ج ۔ میں نے اپنے مضمون میں ایسے مفسروں کے نام لکھے ہیں جنہوں نے اللہ ورسول سے امام وقت ہی سمجھا ہے ، بے شک عرصۂ دراز سے استبداد کے تسلط اور جامد تقلید نے علماء کے زاویہائے نگاہ بدل دیئے ہیں وہ دین اسی کو سمجھتے ہیں کہ کتاب وسنت بلکہ ائمہ کی فقہ پر عمل کرتے رہیں ۔ حالانکہ اس سے

[1] اس وقت ہٹلر موجود تھا۔

اجتماعی زندگی نہیں پیدا ہو سکتی، حیات ملّی کے لئے قرآن کے ساتھ زندہ امام کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

(۵)

س - ایک سُنّی مولانا نے کہا کہ کیا ضمانت ہے کہ امام وقت غلطی نہ کریگا۔

ج - کیا آپ کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما معصوم تھے؟ اگر نہیں تھے تو اُن کو خلیفہ رسول بناتے وقت یہ سوال اُمّت نے کیوں نہیں اُٹھایا۔؟

مگر یہ جواب الزامی ہے، تحقیقی جواب یہ ہے کہ غلط اور صحیح کے جو معنی عرف عام میں ہیں کہ جو حقیقت کے خلاف ہو وہ غلط ہے اور جو حقیقت کے مطابق ہو وہ صحیح ہے وہ نظامِ حکومت اور قانونِ عدالت میں نہیں ہیں۔ یہاں غلط وہ ہے جو بے ضابطہ ہو اور صحیح وہ ہے جو با ضابطہ ہو۔ ہمارے اصلیین نے بھی یہی لکھا ہے کہ قاضی اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ اسلامی قوانین و ضوابط کے مطابق کردے تو چاہے وہ حقیقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ ہوگا، بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ القضاء نافذ ظاہراً و باطناً یعنی نہ صرف شرعاً بلکہ اللہ کے نزدیک بھی۔

ظاہر ہے کہ امام اُمّت کا قابل ترین مرد یا بہترین شخصوں میں سے ایک ہوگا جس کے ساتھ قرآن کی روشنی اور مشورہ کے لئے منتخب جماعت بھی ہوگی

پھر ساری اُمت کے ارباب علم و عقل بھی اصلاح کا خیال رکھیں گے ان سب کے بعد بے ضابطگی تو ہو ہی نہیں سکتی اور عرفی غلطی کا بھی خطرہ کم رہ جاتا ہے۔

علاوہ بریں غلطی سے اس قدر خوف کیوں ہے، فطرت نے اس کو انسان کی سرشت میں اسواسطے رکھا ہے کہ وہ زیادہ چوکنا ہوشیار اور خبردار رہے، اس لئے وہ انسان کی ترقی میں معاون ہے اور قصداً نہ ہو تو اس سے جس قدر نقصان ہو جاتا ہے بعض حالتوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچتا ہے اور غلطیاں کر کر کے ہی لوگ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

(۶)

ایک شیعہ بزرگ نے فرمایا کہ مسئلہ امامت میں تم اسی نقطہ پر آگئے جو ہماری جماعت کا ہے مگر یہ واضح نہیں ہوا کہ امام منصوص ہونا چاہیئے جیسا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے یا جمہوری جیسا کہ سُنی کہتے ہیں۔

ج۔ میں کسی فرقہ بندی کا قائل نہیں، میں نے جو کچھ لکھا ہے بلا خیال شیعہ یا سُنی کے خالص قرآنی تعلیم کو لکھا ہے میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ قرآن جو تمام مسلمانوں کی دینی کتاب ہے اور سب کے سب بلا استثنا اس پر ایمان رکھتے ہیں اس کی روشنی میں حسب اقتضائے زمانہ و ضرورت ملت کو چلانے اور ان سے اطاعت لینے کے لیے زندہ امام ناگزیر ہے اور بدوں اس کے امت کی اجتماعی زندگی کی کوئی صورت نہیں۔

رہا امام منصوص کا عقیدہ تو اس کا ثبوت قرآن سے نہیں ملتا۔ اس لئے

میں امام متفق علیہ کا قائل ہوں یعنی جس پر جمہور اُمت اتفاق کرے۔ شرط یہی ہے کہ وہ قرآن کا تابع ہو اور شوریٰ سے کام کرے۔

(۷)

انہوں نے پھر سوال کیا کہ متغلب بھی امام ہو سکتا ہے؟ اور خلفائے بنی اُمیہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ج۔ میں کہہ چکا ہوں کہ امام وہ ہے کہ جو قرآن اور اُمت کے شوریٰ کے مطابق کام کرے۔ تغلب بھی امت کی شرکت ہی سے ہوتا ہے اس لیے متغلب بھی امام ہو سکتا ہے بشرطیکہ ملت کا اس پر اتفاق ہو جائے۔

خلفائے بنی اُمیہ میں استبداد تھا اور وہ مسلمانوں کے بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے، اس لئے وہ دنیاوی بادشاہ تھے، نہ کہ امام، بجز حضرت عمر بن عبدالعزیز کے،

(۸)

س۔ کیا ایک زمانہ میں کئی امام ہو سکتے ہیں؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ نیز اس سے ملت کی وحدت فنا ہو جائے گی۔ ہاں امامِ وقت کے ماتحت مختلف اقوام وممالک میں ہزاروں امام بیک وقت ہو سکتے ہیں۔ یہ قرآنی اصطلاح کے مطابق اولوالامر کہے جائیں گے۔

(۹)

س- موجودہ زمانہ میں امامت نصب کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

ج- آج کل سلطنت کا صرف ۱/۱۰ حصہ آزاد ہے اور ۹/۱۰ غیروں کا محکوم نصب امام آزاد مسلم قوموں کا فریضہ ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اُن کا رُخ بھی اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرکز قائم کریں۔

مرکزیت

اسلامی نظام کا عُروۃ الوثقیٰ

(اسلامی نظام کے سلسلے میں محترم پرویز صاحب نے نومبر ۱۹۳۸ء میں ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا۔ چونکہ یہ مقالہ ان مقامات کی توضیح کرتا ہے جو گذشتہ صفحات میں آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس لئے اسے بھی اس سلسلے میں شامل کر دیا جاتا ہے۔)

معتقدات انسان کی گراں بہا متاع عزیز ہوتے ہیں۔ اور جب وہ ایک مرتبہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائیں تو نکالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ جب انسان اُنہیں اعماق قلب سے جدا ہوتے دیکھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میری دُنیا لُٹ رہی ہے، میری عاقبت خراب ہو رہی ہے، حالانکہ ہو سکتا ہے کہ وہی رفقائے محترم جنہیں اُس نے دل کے نازک ترین گوشوں

معتقدات کی گہرائیاں

ہیں جانِ مدعا بنا کر بڑی محبت اور تپاک سے چھپا رکھا ہے، بجائے خویش غارت گرِ ایمان ودیں اور رہزنِ علم و بصیرت ہوں۔" پھر چونکہ انسان اپنے معتقدات کو بالعموم وراثت میں پاتا ہے، اس لئے ان کا تقدس کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے، وہ اُن پر کسی قسم کی تنقیدی نگاہ ڈالنا اپنے آبا واجداد کی شان میں سوءِ ادبی سمجھتا ہے، اور بزرگوں کی اس لاہوتی امانت کو اپنی خوش عقیدگی کے حسین غلاف میں لپیٹ کر آگے منتقل کر دیتا ہے۔ یوں ہی غلاف پر غلاف چڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس امانت کی عظمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پاتا کہ ان غلافوں کو اتار کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اُن کے اندر کیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی اس "متاعِ ملفوف" کے متعلق اتنا بھی کہہ دے کہ کسی کے سامنے نہ سہی کبھی تنہائی میں اطمینان تو کر لو کہ یہ ہے کیا! تو اس بات کا تصور تک اُس کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے، لرزشِ قلب سے اُس کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوتا ہے، اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگ جاتے ہیں، وہ ڈرتا ہے، کانپتا ہے، اور اس وسوسۂ شیطانی پر اپنے بزرگوں کی روحوں سے معافی مانگتا ہے، اُن کے سامنے گڑگڑاتا ہے، اور اس گناہ کے کفارہ کے طور پر اس مقدس امانت پر عقیدت کا ایک اور غلاف چڑھا دیتا ہے۔ جب کوئی پوچھنے والا اس کے اس طرزِ عمل کی صحت کی دلیل طلب

کرتا ہے، تو اس کے جواب میں وہ صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ (۴۳/۲۳) ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا، اور ان ہی کے نقوشِ قدم پر خود چلتے جا رہے ہیں، اور یہ کہہ کر سمجھ لیتا ہے کہ میں نے اپنے برسرِ حق ہونے کی ایک مسکت دلیل پیش کر دی ہے، حالانکہ یہ ایک فریب ہوتا ہے، جس میں وہ اپنے آپ کو مبتلا رکھتا ہے قرآنِ کریم اس روشِ زندگی کو اندھی تقلید کہتا ہے، کھلی ہوئی گمراہی قرار دیتا ہے اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ کہہ کر انسانیت سے گری ہوئی یعنی حیوانیت کی ذہنیت بتاتا ہے بلکہ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ کے اضافے سے ایسے انسانوں کو حیوانوں سے بھی زیادہ راہ گم کردہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اُن لوگوں کی راہ ہے، جو سہولیت پسند ہو جاتے ہیں۔ آرام طلب بن جاتے ہیں (مُتۡرَفِیۡنَ ۴۳/۲۳) اس لئے کہ جس راہ پر آباء و اجداد کو چلتے دیکھا اس پر آنکھ بند کر کے چلتے جانا نہایت تن آسانی کا راستہ ہوتا ہے، راہِ تحقیق جاں گدازی اور جگر کاوی کی راہ ہوتی ہے لیکن قرآن کریم اس کورانہ تقلید کے برعکس حق و اعتدال کی راہ کچھ اور بتاتا ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی بصیرت سے کام لے۔ دیدۂ اعتبار اور گوشِ ہوش کو وا کرے اور اُن کی مدد سے قرآن کریم کی روشنی میں صحیح اور غلط۔ حق۔ اور باطل، کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرتا جائے، اور یوں قلبِ سلیم کو ایمانِ خالص اور معتقداتِ صحیحہ کا محفوظ خزانہ بنا لے۔

اندھی کی تقلید

یہ وہ صراطِ مستقیم ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲/۱۰۸)

اُن سے کہدو کہ میں اور میری اتباع کرنے والے خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں

ان دونوں راستوں کو سامنے رکھئے، اور پھر کبھی رات کی تنہائیوں میں، نیند سے کچھ وقت پہلے، محض خالصتہً للہ سوچئے کہ آپ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ کون سی راہ ہے، غالباً آپ یہی کہیں گے کہ ہمیں تو ہمارے دل نے ہمیشہ یہی جواب دیا ہے کہ جس راہ پر تم جارہے ہو، وہی حق و عدل کا صراطِ مستقیم ہے۔ لیکن میں گذارش کروں گا کہ اگر اس کے بعد آپ نے کبھی اپنے دل سے اس قسم کے سوال کرنے کی ضرورت محسوس کی، تو ان امور کو پیشِ نظر رکھ کر سوال کیجئے جو آیندہ سطور میں آپ کو ملیں وفیھا اٰیات لقوم یعقلون

رسول اللہ کا پیش کردہ دین

آپ تاریخ اسلام کے اوراق کو قریب ساڑھے تیرہ سو برس پیچھے الٹئے اور دیکھئے کہ وہاں آپ کو کیا نظر آتا ہے، آپ کو ایک اور صرف ایک چیز نظر آئے گی۔ اور وہ یہ کہ نبی اکرم صلعم نے ایک دین پیش کیا جو خدائے واحد کی طرف سے دینِ واحد تھا جس میں کوئی تضاد نہ تھا، تباین نہ تھا، تخالف نہ تھا، اور اس دین پر عامل ایک جماعت

تیار کی جو اُمتِ واحدہ تھی، باہم متحد تھی، اس میں کہیں تشتت نہ تھا، انتشار نہ تھا۔ افتراق نہ تھا، تشیع نہ تھا، تحزب نہ تھا، ایک گروہ تھا، کوئی دوسرا گروہ نہ تھا، ایک فرقہ تھا، کوئی دوسرا فرقہ نہ تھا، ایک مسلک تھا، کوئی دوسرا مسلک نہ تھا، ایک راستہ تھا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، ہر ایک کا قدم ایک منزل کی طرف اُٹھتا تھا، اور ہر ایک کا رُخ ایک قبلۂ مقصود کی طرف رہتا تھا۔ آپ اس منظر کو بنظر غائر دیکھئے۔ ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفوت اللہ کے اس دین میں کہیں کوئی شکن نظر نہیں آئے گی۔ پھر دیکھئے۔ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور کیا کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ نہیں! بار بار دیکھئے۔ ثمّ ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئًا و ھو حسیر نگاہ تھک کر آشیانۂ چشم میں واپس آجائے گی۔ لیکن اس وحدتِ دین اور وحدتِ ملت میں تفریق و اختلاف کا کوئی شائبہ نہیں پائے گی۔ یہ وحدت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں، حتیٰ کہ غیر مسلموں تک کو انکار نہیں، آپ کسی شیعہ سے پوچھئے یا سُنی سے مقلد سے پوچھئے یا غیر مقلد سے، حنفی سے پوچھئے یا شافعی سے، ان سب کا ایک اور صرف ایک جواب ہو گا۔ رسول اللہ کے زمانے میں مسلمان ایک جماعت تھے، اُن کا ایک دین تھا۔ نہ اصول میں کوئی دوسری راہ تھی، نہ فروع میں کوئی دوسرا مسلک۔ نبی اکرمؐ نے اُمت واحد چھوڑی اور اس اُمت سے تاکیدًا کہدیا کہ دیکھنا اس وحدت کو شرک میں نہ بدل دینا۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ

دیکھنا! کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے جو (وحدت) دین میں تفرقہ اندازی کرتے ہیں، اور خود (جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے) فرقے بن جاتے ہیں۔ پھر ہر ایک فرقہ اپنے اپنے معتقدات (کو صحیح سمجھ کر مطمئن) مسرور ہو رہا ہے۔

موجودہ مسلمان

اب جتنے ورق آپ نے پیچھے اُلٹے تھے اتنے ہی آگے بڑھ آئیے۔ اور اپنے موجودہ دور میں پہنچ جائیے۔ پھر نگاہ ڈالیے اور تلاش کیجیے اس وحدتِ دین کو۔ اس وحدتِ ملت کو، اُس ایک مسلک کو۔ اور اُس مسلک پر چلنے والی ایک جماعت کو کہیں اُس کا نشان بھی ملتا ہے؟ چھوڑیے اس حدیثِ الم کو کہ اس تیرہ سو برس میں یہ کیسے ہو گیا۔ لیکن دیکھئے صرف یہ کہ یہ کیا ہو گیا؟ کیا دین اپنی موجودہ شکل میں وہی دین ہے، جو نبی اکرمؐ نے چھوڑا تھا؟ کیا ملتِ اسلامیہ، اپنی موجودہ صورت میں وہی ملت ہے جس کی تشکیل حضورؐ نے فرمائی تھی؟ کیا وہ قوم جس کو وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (دیکھنا مشرکین میں سے نہ ہو جانا) کی تنبیہ کی گئی ہے، اُس کی یہی ہیئت ہونی چاہیئے تھی! کہاں ہے وہ دینؐ جس کو نبی اکرمؐ نے هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا

قرار دے کر فَاتَّبِعُوْہُ کا حکم دیا تھا، (یعنی یہ ہے میرا سیدھا راستہ، بس اسی ایک راستہ کی اتباع کرنا، اور وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ کے انتباہ سے یہ بتادیا کہ اگر بہت سے راستے اختیار کرلوگے تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔

ایک چیز تو واضح ہے کہ جب دین ایک تھا، راستہ ایک تھا، جماعت ایک تھی، تو آج کہنے کو بہتر لیکن حقیقت کے اعتبار سے بہتر سو راستوں میں سے ہر ایک راستہ تو سیدھا راستہ نہیں ہوسکتا۔

آپ کا دل شاید آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کردے کہ جس راستے پر میں ہوں یہی وہ راستہ ہے جو نبی اکرمؐ نے بتایا تھا اور اس کے علاوہ باقی راستے وہ ہیں جو بعد کی پیداوار ہیں۔ ہاں! یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیجئے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ عین اسی وقت آپ کے کمرہ سے ملحق دوسرے کمرہ میں، آپ کے مسلک سے جداگانہ مسلک کا حامل، دوسرا مسلمان (مثلاً آپ مقلد ہیں تو غیر مقلد) یہی کچھ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے رہا ہے، کہ جس راستہ پر میں ہوں، وہی راستہ حق و اعتدال کا ہے۔ دوسروں کی راہ نجات و سعادت کی راہ نہیں ہے، آپ کہدیں گے کہ وہ غلط کہتا ہے، وہ کہدے گا کہ آپ غلط کہتے ہیں۔ اور "کہہ دیگا" کیا؟ ہر روز یہی ہوتا ہے، اور یہ وہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے کہ کل حزب بما لدیھم فرحون ہر فرقہ اپنے آپ کو صراط مستقیم پر سمجھ کر

مگن ہو رہتا ہے۔

کیا سب سچے ہیں؟ تو کیا اس کو مان لیا جائے کہ آپ بھی صحیح کہتے ہیں اور وہ بھی صحیح کہتا ہے! اور اس طرح ان سینکڑوں مختلف سمتوں کی طرف جانے والے راستے سب صراط مستقیم ہیں۔ اُسے تو نہ آپ تسلیم کریں گے نہ کوئی اور۔

اس سوال کو ذرا اور آگے بڑھایئے اور مسئلہ کو من حیث الاسلام دیکھئے یعنی دنیا کے چالیس کروڑ مسلمان ایک مذہب سے متمسک ہیں، جسے اسلام کہتے ہیں۔ اس مذہب کی حالت یہ ہے کہ اس کے اندر سینکڑوں فرقے موجود ہیں۔ کیا یہ مذہب وہی ہو سکتا ہے، جو نبی اکرم ؐ نے اُمت کو دیا تھا، جس کے اندر کہیں اختلاف نہ تھا۔ کوئی فرقہ نہ تھا؟

یعنی ایسا مذہب جس میں کوئی اختلاف، نہ ہو، کوئی فرقہ نہ ہو، بلکہ فرقہ سازی شرک ہو۔ (یعنی عہد رسالتمآب کا دین)، وہ بھی اسلام۔ اور ایسا مذہب جس میں سینکڑوں فرقے اور ہزاروں اختلافات ہوں۔ (ہمارا موجودہ مذہب) وہ بھی اسلام۔

اس تعدد فرق کے خلفشار کا شاید آپ صحیح اندازہ نہ لگا سکیں، اس کے متعلق کسی نومسلم سے پوچھئے مثلاً ایک شخص ہندو ہے، وہ کفر پر ہے، اس راستہ پر ہے جو جہنم کی طرف لیجانے والا ہے اُسے آپ اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور

وہ مسلمان ہو جاتا ہے لامحالہ وہ مسلمانوں کے اسی فرقہ میں داخل ہوگا جو آپ کا فرقہ ہے یعنی اُس کا فرقہ جس نے اسے مسلمان کیا ہے، لیکن یہاں پہنچ کر وہ دیکھتا ہے کہ ایک دوسرے فرقہ کا مسلمان اسے کہتا ہے کہ ناجی فرقہ تو ہمارا ہے، یہ تم کہاں آپھنسے؟ یہیں تک نہیں، بلکہ وہ اس فرقہ کے خلاف تکفیر کے فتاویٰ بھی دکھا دیتا ہے۔ وہ نو مسلم حیران ہے کہ کفر کو چھوڑ کر اسلام لایا، جہنم سے بچنے کے لئے آبا و اجداد کا مسلک چھوڑا۔ لیکن بایں ہمہ وہ کفر کا لیبل اب بھی اس کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جہنم سے بھی نجات نہیں ملے گی۔ وہ کسی دوسرے فرقہ میں جاتا ہے تو اسی قسم کی آوازیں اور سمتوں سے آنی شروع ہو جاتی ہیں۔

کہیے! وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟

خدا اور رسول کی اطاعت

آپ کہیں گے کہ اسلام نام ہے اطاعت خدا اور رسول کا، لہٰذا جب میں خدا اور رسول کی اطاعت کر رہا ہوں تو صحیح مذہب پر ہوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کے کرے یہ محقق کرے والا مسلمان، جو دوسرے فرقہ سے متعلق ہے بعینہٖ یہی کچھ کہہ رہا ہے اور کونسا فرقہ ایسا ہے جس کا دعویٰ "خدا اور رسول کی اطاعت" نہیں۔

آپ کہدیں گے کہ اس کا فیصلہ کچھ مشکل نہیں، خدا اور رسول کی اطاعت کا معیار ہمارے پاس کتاب اللہ اور احادیث مقدسہ موجود ہیں اُن پر پرکھ کر دیکھ لیا

جائے گا کہ کس کا دعویٰ صحیح ہے۔ لیکن آپ کے مدمقابل فریق ثانی کا بھی تو یہی دعویٰ ہے! اگر ان لوگوں سے قطع نظر کر لی جائے جنہیں رغلط یا صحیح منکرین حدیث کہا جاتا ہے باقی سب مسلمان یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ اطاعت خدا اور رسول کے دعوے کو کتاب وسنت پر پرکھ کر دیکھو۔ لیکن ان دعاوی کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے اختلافات کو چھوڑیئے آپ صدیوں سے اس معمولی سے اختلاف کا بھی فیصلہ نہیں کر سکے، کہ نماز میں آمین بلند آواز سے کہنی چاہیئے یا آہستہ، حالانکہ فریقین کے علماء کے سامنے قرآن کریم بھی ہوتا ہے اور احادیث مقدسہ بھی۔ اور اگر اس کے ساتھ اجماع کے معیار کو بھی شامل کرنا چاہیں تو دونوں فریق مختلف تاویلات سے اس امر کے بھی مدعی ہوتے ہیں کہ اجماع ان کے ساتھ ہے ؛

جب حالت یہ ہے تو پوچھئے اپنے دل سے کہ اس کا فیصلہ کس طرح کیا جائے کہ کون سا مسلک "اطاعت خدا و رسول" کے مطابق ہے؟ یہاں پہنچ کر ایک مرتبہ پھر یہ سمجھ لیجئے کہ آپ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہ دے لیں کہ جس مسلک سے آپ متمسک ہیں، وہی مسلک درست ہے اور اس لئے درست ہے کہ یہ مسلک آپ کو آباء و اجداد سے وراثت میں ملا ہے۔ اندریں حالات آپ سوچئے کیا وہی بصیرت جس پر قرآن کریم نے دعوت الی اللہ کی بنیاد رکھی تھی، اس کا تقاضا نہیں کہ آپ علم و ایقان کے ساتھ مطمئن ہو جائیں کہ وہ کون سی راہ تھی جو نبی اکرمؐ امت کو دے کر گئے تھے۔ اگر آپ اس قسم کے اطمینان کی ضرورت سمجھتے ہیں تو پھر سلسلۂ سخن یوں

آگے بڑھے گا کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ راہ کون سی تھی، اور گاڑی کہاں سے اپنی صحیح پٹری چھوڑ کر دوسرے رُخ پر چل پڑی تھی۔

گم گشتہ کڑی

ایک چیز تو مسلمانوں میں آج بھی ایسی موجود ہے جس کے متفق علیہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں، اور وہ ہے قرآن کریم۔ ہر مسلمان اس کا قائل ہے، غیر مسلم تک بھی قائل ہیں، خود خدا اس کا شاہد ہے کہ قرآن کریم حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے اُمت کو ملا تھا۔ اور یہ وہی قرآن کریم ہے جو "اطاعتِ خدا اور رسول" کے دعوے کو پرکھنے کے لئے ہمارے مختلف فرقوں کے پاس موجود ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کے باوجود ہمارے اختلافات نہیں مٹتے تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے ساتھ کسی اور چیز کا ہونا بھی ضروری ہے، جس کی مدد سے اُمت کو وہ راستہ مل سکتا ہے۔ جو ان کے لئے قرآن کریم متعین کرتا ہے اور جسے نبی اکرمؐ قرآن کریم کے ساتھ چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے، اور جو آج موجود نہیں ہے اور جس کے فقدان سے ہماری یہ حالت ہو رہی ہے۔

وہ چیز کیا تھی؟ بس یہ ہے وہ گم گشتہ کڑی جس کے مل جانے سے یہ بکھری ہوئی زنجیر پھر سے حبل المتین بن جائے گی۔

یہ گم گشتہ کڑی ہے وہ جماعت جسے نبی اکرمؐ متشکل فرما کر تشریف لے گئے تھے جو کتاب اللہ کی وارث تھی۔ جو قوانینِ الٰہیہ کو اس دنیا میں نافذ کرنے والی تھی،

کنتم خیر امۃ کی مخاطب تھی۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر جس کا فریضہ تھا جسے "امۃ وسطا" کا لقب دیا گیا تھا، جس کے تمکن فی الارض سے دین کا قیام تھا۔ یہہ وہ جماعت تھی جو چلتی پھرتی قرآن تھی۔ جیتی جاگتی قرآن تھی۔ کتاب اللہ حروف و نقوش میں لکھی ہوئی تعلیم تھی، یہ جماعت اس تعلیم کی پیکر ناطق تھی۔ یہ عین مشیت ایزدی کے ماتحت خود رسالت مآب کے مقدس ہاتھوں سے تیار ہوئی تھی اور تیار اس لئے کی گئی تھی کہ دنیا کو بتا دیا جائے کہ معراج انسانیت کا مظہر اتم اسے کہتے ہیں، باب نبوت کو اس لئے بند کر دیا گیا تھا کہ خدا کا آخری پیغام۔ اپنی مکمل اور محفوظ شکل میں دنیا کے پاس موجود تھا اور اس پیغام کی حامل ایک ایسی جماعت تھی جو ہر مشکل مقام پر اس نور مبین کی روشنی میں نوع انسانی کی راہ نمائی کر سکے۔ اس جماعت میں جو اتقی (سب سے زیادہ متقی) ہوتا تھا، وہ اکرم (سب سے زیادہ قابل عزت) ہونے کی حیثیت سے اُن کا مرکز ہوتا تھا امرھم شوریٰ بینھم (اُن کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پائیں گے) کے ماتحت اس جماعت کے منتخب افراد اس مرکز کے اعیان و ارکان ہوتے تھے، اور اس نظام کے ماتحت، یہ مرکز اس امر کا فیصلہ کرتا تھا کہ "خدا و رسول کی اطاعت" کسے کہتے ہیں۔ چونکہ مرکز ایک تھا۔ اس لئے اس کا فیصلہ بھی ایک ہوتا تھا، لہذا دین ایک تھا دین کی حامل جماعت ایک تھی۔

دینی نظام

جماعت کا مسلک ایک تھا۔ ان کا نظام ایک تھا۔ لہذا یہ گم گشتہ کڑی درحقیقت اُمتِ مسلمہ کا دینی نظام تھا۔

زیادہ وضاحت سے اسے یوں سمجھئے کہ مسلمانوں کے لئے خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت جائز نہیں (ان الحکم الا للہ۔ حکومت صرف اللہ ہی کے لئے ہے) لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ ہر شخص سے براہ راست باتیں نہیں کرتا، اس لئے یہ بتلانے کے لئے کہ اللہ کی اطاعت کس طرح کی جاتی ہے اُس نے رسول اکرمؐ کی وساطت سے اپنی کتاب نازل فرمادی۔ لہذا کتاب اللہ کی اطاعت، عین اطاعتِ خدا ہوگئی (اِتَّبِعُوا مَا اُنزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ ۷/۳) جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو، اور اس کے سوا کسی کارساز کی اطاعت نہ کرو) لیکن کتاب کی اطاعت انفرادی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی اطاعت اجتماعی صورت میں ممکن تھی۔ اطاعتِ کتاب کا یہ اجتماعی نظام رسول اللہ نے متشکل فرمایا۔ رسول اللہ خود اس نظام کے مرکز تھے۔ امام تھے۔ بنابریں اطاعت کتاب یعنی اطاعتِ خدا کا صحیح مفہوم قرار پایا رسول (یعنی مرکز نظام دین) کی اطاعت (من یطع الرسول فقد اطاع اللہ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی)، رسول اللہ کے بعد کتاب تو موجود رہی۔ لیکن کتاب کی تعلیم کو محسوس و مرئی شکل میں پیش کرنے والا کون تھا؟ یہ تھے خلیفۃ الرسول (رسول کے جانشین)، لہذا اب خدا اور رسول کی اطاعت۔۔ یہ خلیفۃ الرسول کی اطاعت میں منتقل ہوگئی، نبی اکرمؐ کی تشریف براری کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے فیصلوں کی اطاعت، خدا اور رسول کی اطاعت تھی۔ اور ان سے انحراف خدا اور رسول کی اطاعت

سے انحراف تھا۔ یہ تھا صحیح مفہوم "اطاعت خدا اور رسول" کا یعنی اس مرکزِ ملت کی اطاعت جو کتاب اللہ کے مطابق نظام مملکت قائم کرے۔ اطاعتِ خدا رسول" کے اس مفہوم کے بعد کسی تفرقہ اندازی، افتراق انگیزی کی گنجائش نہ تھی کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں جب مسلمانوں کے ایک قبیلہ نے زکوٰۃ کے مسلک میں مرکز کے مسلک سے اختلاف کیا تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، اور صحابۂ کبار نے اس فیصلہ کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کی طرح کی جب تک یہ شکل قایم رہی، خدا اور رسول کی صحیح اطاعت ہوتی رہی، دین کی وحدت قایم رہی، جماعت کی یک جہتی قایم رہی، لیکن یہ دورِ سعادت جلد ختم ہو گیا، خلافت

اُس کے بعد!

ملوکیت میں بدل گئی۔ حکومت نے اپنا فریضہ انتظام سلطنت سمجھ لیا حالانکہ سلطنت ان کو ملی ہی اس لئے تھی کہ وہ قوانین الٰہیہ کا نفاذ کرتے رہیں اور یوں خدا اور رسول کی اطاعت کا سلسلہ آگے بڑھاتے رہیں لیکن اس سلسلہ کے ٹوٹنے کے بعد ہوا یہ کہ امورِ سلطنت کے متعلق معاملات حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے لیکن امورِ دین کے متعلق معاملات افراد پر چھوڑ دیئے۔ یہ وہ منحوس دن تھا جب سب سے پہلے اسلام میں دین اور دنیا —————— کی تفریق شروع ہوئی، جب اس طرح اجتماعیت کی جگہ انفرادیت آ گئی تو اطاعتِ خدا و رسول کا مفہوم بھی بدل گیا، ایک نے کسی معاملہ کو ایک طرح سمجھا اس نے اسی کو اطاعتِ خدا و رسول قرار دے دیا۔ دوسرے نے اس سے مختلف سمجھا، وہ بھی اطاعت خدا

اور رسول سمجھ لیا گیا کچھ لوگ اس کے ہم خیال ہو گئے کچھ اُس کے۔ یوں فرقہ بندی کی ابتدا ہوئی، جب تک سلطنت باقی تھی۔ امورِ دنیا کے متعلق ہی سہی۔ کچھ نہ کچھ اجتماعیت کی شکل موجود تھی۔ جب سلطنت بٹ گئی یا ریاستوں میں بٹ گئی تو یہ رہی سہی اجتماعیت بھی ختم ہو گئی۔ اب ہر شئے میں انفرادیت آ گئی؛ اور یوں خدا اور رسول کی اطاعت کا مفہوم مختلف دماغوں کے قالب میں ڈھل کر مختلف شکلیں اختیار کر گیا۔ مرکز ٹوٹا جماعت منتشر ہو گئی؛ دین افراد کی آراء کے تابع چلنے لگا، اور کثرتِ تعبیر سے خواب پریشان تر ہوتا چلا گیا، جب تک مرکز قایم تھا اور صحیح شکل میں قایم تھا تو وہی ایک ٹکسال تھی جہاں کے مضروب سکے کا چلن بازار میں ہوتا تھا، وہ ٹکسال ٹوٹ گئی تو گھر گھر ٹکسالیں بن گئیں اور ہر ٹکسال والوں کا یہ دعویٰ ہو گیا کہ ہمارا سکہ اصلی ہے، دوسروں کا جعلی ہے، یہ کام مرکز کا تھا کہ وہ متعین کرے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت کی تفسیر کیا ہے؛ حدیث کون سی صحیح ہے اور کون سی ضعیف۔ فلاں حکم پر کب تک اس طرح عمل رہے گا اور کب اس میں رد و بدل کیا جائے گا۔ فقہ کا فلاں مسئلہ کس وقت تک نافذ العمل رہے گا، یہی وجہ ہے کہ اس دورِ سعادت میں نہ کوئی تفسیر لکھی گئی نہ احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے۔ نہ فقہ کی تدوین ہوئی۔ جب مرکزیت ٹوٹ گئی یا اپنے فریضۂ الٰہی سے غافل ہو گئی تو امت پریشان تھی کہ اب کس طرح معلوم کرے کہ فلاں معاملہ میں ارشادِ خداوندی کا منشا کیا ہے، اور اس منشائے ایزدی پر عمل کس طرح سے ہو گا؟ اسی ضرورت کے ماتحت انفرادی طور پر قرآن کریم کی تفاسیر لکھی گئیں، احادیث کے

انفرادی دین

صحیح وضعیف ہونے کے معیار تجویز ہوئے فقہی مسائل کی ترویج و تنسیخ کے متعلق بحثیں چھڑ گئیں۔ ہمارا مقصد

اس سے یہ نہیں کہ ان حضرات نے فرقہ بندی کے خیال سے ایسا کیا، کہنا صرف یہ ہے کہ جماعت کے انتشار اور مرکز کے فنا ہو جانے کے بعد جب اجتماعیت کی جگہ انفرادیت آگئی تو اس انفرادیت کا فطری نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ اس میں کسی کی نیت کا کوئی دخل نہ تھا نیتیں کتنی ہی نیک ہوں۔ مقاصد کتنے ہی پاکیزہ ہوں، وحدت مرکز کے ٹوٹ جانے سے اطاعت خدا اور رسول کے یہ مختلف مفہوم پیدا ہو جانے ضرور تھے کتاب اللہ موجود تھی۔ عہد رسول اللہ اور صحابہ کے آثار ونظائر بھی موجود تھے۔ لیکن وہ جماعت اور جماعت کا وہ مرکز موجود نہ تھا جو فیصلہ کیا کرتا تھا کہ فلاں معاملہ میں مسلمانوں کے لئے خدا اور رسول کی اطاعت کس طرح ہو گی۔ فلاں اختلافی مسئلہ میں نقطۂ اعتدال کون سا ہے؟ مرکز کی موجودگی میں جب وہاں سے فیصلہ مل جاتا تو کسی شخص کو یہ حق نہ رہتا کہ وہ اپنے طور پر جس طرح جی چاہے، "خدا اور رسول کی اطاعت" کرے، حتیٰ کہ اس باب میں وہ اس قدر محتاط ہوتے تھے کہ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالتے تھے جو اُس مفہوم اطاعت کے خلاف ہو جو مرکز نے متعین کیا ہو امام اعظمؒ کی عظمت سے کون واقف نہیں اور فقہی امور میں ان کے اجتہاد سے کسے انکار ہے۔ اگرچہ ان کے عہد میں ملوکیت تھی، خلافت نہ تھی، لیکن اس کے باوجود انفرادیت کی جگہ مرکزیت کے احترام کا اس وقت بھی یہ عالم تھا کہ چونکہ شہر میں

مفتی ایک اور صاحب تھے جو سلطنت کی طرف سے متعین تھے۔ اس لئے لوگ انفرادی
طور پر بھی دریافت کرتے تو آپ کبھی فتوٹی نہ دیتے۔ حتیٰ کہ ایک دن گھر میں بیٹھے تھے،
لڑکی نے پوچھا کہ ابا جان میں روزہ سے ہوں اور دانتوں سے خون نکل کر حلق میں
چلا گیا ہے۔ روزہ ٹوٹ گیا یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ "بیٹیا! میں نہیں بتانا چاہتا
کیونکہ میں گورنر کی طرف سے فتوٹی دینے کا مجاز نہیں ٹھیرایا گیا" لیکن مرکز کے نہ رہنے
سے جو حالت پیدا ہو گئی اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجیئے کہ آج کوئی بھی اپنے آپ کو "امام
اعظم" سے کم نہیں سمجھتا، اس مرکزِ ثقل کے نہ ہونے سے تمام ذرے منتشر ہو رہے
ہیں، اس شیرازہ کے ٹوٹ جانے سے کتابِ ملتِ بیضا کے تمام اوراق بکھرے
پڑے ہیں۔ قرآن کریم، احادیث، فقہ، تفسیر، تاریخ کی تمام کتابیں موجود ہیں لیکن
اُمت کا ایک ادنیٰ سا اختلاف بھی نہیں مٹ سکتا۔ اس لئے کہ اگر صرف کتابوں سے
راستے متعین ہو جایا کرتے تو کتابوں کے احکام کو نافذ کرنے والے رسولوں کی ضرورت
ہی نہ تھی۔ کتاب کے ساتھ رسول بھیجنے کی ضرورت خود اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک

امامت ہمیشہ کیلئے رہنی چاہیئے

کتاب نافذ العمل رہے گی اس وقت تک
رسول ؐ کے جانشینوں کی بھی ضرورت
رہے گی، اور چونکہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے دیا گیا
ہے اس لئے قیامت تک کے لئے رسول ؐ کے جانشین۔ یعنی مرکزِ ملت کی ضرورت
ہے۔ کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا۔ قرنِ اولیٰ میں "خلافتِ رسول" کا

جیتا جاگتا تصور اس درخشندگی اور تابناکی سے نگاہوں کے سامنے تھا کہ ہر چند مرکز
کو گم ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں لیکن اس کے دھندلے نقوش ابھی تک دلوں میں
باقی ہیں، نماز کا امام ابھی تک "جانشینِ رسول" کہلاتا ہے۔ خطبہ کے منبر کو ابھی تک
منبرِ رسول ؐ کہتے ہیں۔ کل تک ترکوں کی ملوکیت اپنی مسخ شدہ صورت میں بھی "خلافت"
ہی کہلاتی تھی۔ لیکن چونکہ یہ صرف الفاظ تھے جو ایک مدت سے اپنے اصلی معنی کھو چکے
تھے۔ لاشیں تھیں جن سے ایک عرصہ ہوا روحیں پرواز کر چکی تھیں۔ اس لئے مضطرب
قلوب کو ان میں کہیں سکون و طمانیت کے سامان نہیں ملتے تھے۔ ملت کے صحیح
نظام کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے سے مسلمان اسلام کے مستقبل سے کس طرح
مایوس ہونے شروع ہو گئے، اس کا اندازہ آپ کو بہائیت اور مرزائیت کی تحریکوں
سے لگ سکتا ہے۔ ایک نے یہ اعلان کر دیا کہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے
نافذ العمل نہیں ہو سکتا کیونکہ اب وہ (نعوذ باللہ) ایک ایسا درخت ہو چکا ہے جو
مزید پھل نہیں دے سکتا۔ دوسرے نے دعوےٰ کر دیا کہ نبوتِ محمدیہ قیامت کے
لئے جاری نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ اس سراج منیر کی روشنی (نعوذ باللہ) اب ایک اور
قندیل کی محتاج ہو چکی ہے۔ آپ ذرا سوچئے کہ اگر یہ آوازیں

مدعیانِ نبوت

عہدِ سعادت میں جس میں صحیح اسلامی نظام قائم تھا کہیں تحت
الثریٰ کے نیچے سے بھی پیدا ہوتی تو مسلمان اُس کو برداشت کر لیتا؟ اس لئے نہیں
کہ ان کا "تعصب" (نعوذ باللہ) انہیں اجازت نہ دیتا کہ وہ اسے سُن لیں، بلکہ اس لئے

کہ وہ شجرِ طیب جس کی جڑیں قلب زمین سے نم کش تھیں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی تھیں، جس کا مبارک بیج عالمِ ملکوت سے آیا تھا اور جو اس ذاتِ گرامی کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا، جو وجہِ شادابیٔ کائنات ہے اور جسے قدوسیوں کی اس جماعت نے اپنے خون سے سینچا تھا۔ جن کے گھوڑوں کے سموں کی گرد کو خدائے بزرگ و برتر انسانیت کی چشمِ بصیرت کے لئے شہادتِ ایقانی کا نورانی سُرمہ قرار دیتا ہے۔ وہ مبارک درخت جو انہیں جھولیاں بھر بھر کر تر و تازہ پھل دیتا تھا، ایسے پھل کہ جن سے وہ قوت پیدا ہوتی تھی، جس سے زمانے کی تقدیریں اُن کے ہاتھ میں آ گئی تھیں، وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ مقدس درخت کبھی خشک بھی ہو سکتا ہے؟ آج چونکہ مسلمان کے سامنے وہ نظام موجود نہیں، جو یہ بتاتا کہ پیغامِ قرآنی اور نبوتِ محمدیؐ کس طرح ابدیت سے ہمکنار ہے، اس لئے وہ ان راہ گم کردہ لوگوں کو لفظی مناظروں اور نظری مباحثوں سے قائل کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح اُن سے پہلے اختلافات نہیں مٹ سکے، یہ اختلافات بھی بڑھتے جا رہے ہیں ان مدعیانِ نبوت کو بھی چھوڑیئے آج دوسرے مسلمان جو کبھی اس دروازے پہ جھولی پھیلائے نظر آتے ہیں، کبھی اُس سنگِ آستاں پر جبہ سائی کرتے۔ آج ایک کی اقتدا میں فلاح و بہبود کا راز مضمر سمجھتے ہیں۔ کل دوسرے کی۔ یہ سب مسلمان وہ ہیں جو، گو زبان سے اقرار نہ کریں، لیکن دل سے اسلام کے مستقبل سے (معاذ اللہ) مایوس ہو چکے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کو وہی کچھ سمجھے

ہوئے ہیں، جیسا کچھ وہ اس دورِ تشتت و افتراق میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نگاہوں

بازیابی کی صورت

کے سامنے اسلام کا صحیح نظامِ اجتماعیت اور مرکزیت اجاگر ہو جائے، تو پھر دیکھئے کہ یہ مایوسیاں کس طرح امیدوں میں بدل جاتی ہیں۔ اور تذبذب کس طرح ایمانِ محکم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ نظام اس حد تک نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے کہ سرسری نگاہ اس تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو "مترفین کا گروہ" اس کی مخالفت شروع کر دیتا ہے۔ کوئی سمجھتا بھی ہے، تو چونکہ اس کو فوراً عمل میں لانے کے لئے راستے میں مشکلات دیکھتا ہے اس لئے اس کی تن آسانیاں اُسے پھر آرام طلبی کے راستے کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔ غرضیکہ مسلمان ایک ایسے گرداب میں پھنسا ہے کہ ہزار ہاتھ پاؤں مارے وہاں سے باہر نکل نہیں سکتا۔ ان مصائب سے نجات کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ بلا خوف لائمۃ لائم، قرآن کریم کے اس اسلامی نظام کو، اطاعتِ خدا و رسول کے اس صحیح مفہوم کو، مسلمانوں کے سامنے بے نقاب کر دیا جائے۔ اور اسے اس شدت اور تکرار سے بار بار سامنے لایا جائے کہ اُس کی کہربائی شعاعوں سے انفرادیت کے سرطانی جراثیم فنا ہو جائیں اس کے بعد جن حضرات کے سامنے یہ تصور اپنی صحیح شکل میں آجائے وہ تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اس کے عملی قیام میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں، پھر دیکھیں کہ اللہ کی نصرت کس طرح ان کے شاملِ حال

نہیں ہوتی؟ یہ نظام قائم ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ بات بہائیوں اور مرزائیوں کی سمجھ میں خود بخود آجاتی ہے کہ واقعی پیام خداوندی اور نبوت محمدی قیامت تک کے لئے زندہ رو رہیں؛ پھر دیکھئے کہ مارکس اور لینن کس طرح اس نظریہ کو بغیر سمجھائے سمجھ لیتے ہیں کہ قرآن کی رو سے قائم شدہ نظام ربوبیت "شکم کی مساوات" سے کس درجہ بلند و بالاتر ہے۔ پھر دیکھئے کہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر "عالمگیر سچائیاں" ماننے والے[1] کس طرح اس سچائی کے قائل ہو جاتے ہیں کہ اب سچائیاں صرف قرآن کریم کے اندر ہیں۔ پھر سمجھ میں آجائے گا کہ نوع انسانی کی نجات و سعادت کیوں ان ہی اعمال کے اندر پوشیدہ ہے جو قرآن نے متعین کئے ہیں۔ پھر معلوم ہوگا کہ اعمال کے صالح ہونے کے لئے کیوں اُس قسم کے ایمان کی ضرورت ہے جو کتاب اللہ نے تجویز کیا ہے! یہ وہ نظام ہوگا جو اسلام کی حقانیت کی زندہ دلیل ہوگا۔ اور یہ وہ جماعت ہوگی، جس کا وجود خدا کی ہستی کی برہانِ نیر ہوگا اس وقت سمجھ میں آجائے گا کہ حضرت علامہؒ نے یہ کیوں کہا تھا کہ

انا الحق جز مقام کبریا نیست | سزائے او چلیپا ہست، یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ | اگر قومے بگوید نا روا نیست

اب یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ دین کی وحدت کس طرح سے

[1] ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کے ہم نوا "برہمو سماجی" قسم کے مسلمان۔

عمل میں آئی تھی اور کس طرح اسے قایم رہنا تھا۔ لہذا اگر ہم آج بھی چاہیں کہ وہ متاعِ گم گشتہ ہمیں پھر سے مل جائے، وہ لٹی ہوئی دولتیں، وہ چھنی ہوئی عظمتیں

چہ باید کرد؟

پھر لوٹ آئیں، تو اس کے لئے نظری بحثیں اور لفظی مناظرے کوئی کام نہ دیں گے۔ ہم جہاں سے بھولے تھے اور بھول کر اصل راستہ چھوڑا تھا، پھر وہیں پہنچنا ہوگا۔ (توبہ کے۔ یہی معنی ہیں) اور وہاں سے پھر وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ جو سیدھا راستہ تھا جو صراطِ مستقیم تھا اگر آپ چاہیں کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ جس غلط راستے پر ایک دفعہ چل نکلے ہیں اُسی پر چلتے جائیں اور منزل تک پہنچ جائیں تو یہ فریبِ نفس ہے، دھوکا ہے، جھوٹا اطمینان ہے، غلط اقدام ہے۔ آپ چلتے ضرور رہیں گے لیکن ہر قدم آپ کو منزل سے دور لے جائے گا، اُولٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ایسے ہی مقامات کے لئے آیا ہے۔ کہ کام کیا جاتا ہے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ قدم اُٹھتے ہیں لیکن مسافت طے نہیں ہوتی۔ لہذا اس طویل مدت میں جو کچھ ہو چکا ہے اُسے بھول جائیے گاڑی کو پھر وہیں لے جائیے جہاں سے اس کا کانٹا بدل گیا تھا اور یہ دوسری پٹری پر چل نکلی تھی۔ وہاں پہنچ کر آپ کو معلوم ہوگا کہ سیدھا راستہ کونسا ہے قرآن کریم تو آپ کے پاس محفوظ و مصؤن شکل میں موجود ہے۔ دوسری چیز اُس کے ساتھ جماعت اور جماعت میں نصب امامت، قیامِ مرکزیت ہے۔ وہ پیدا ہو جائے تو تمہاری خاک کے ذروں میں نمودِ حیات محسوس ہونے لگے۔ یہ اُجڑے ہوئے

کاشانے پھر سے آباد ہو جائیں، بھولے ہوئے مسافر پھر سے منزل کی طرف رُخ کرلیں
پھر سے ہماری نمازیں، اور ہمارے روزے، ہمارے حج اور ہماری زکوٰۃ اللہ کے
لئے ہو جائیں، اور پھر اُن سے وہ نتائج پیدا ہونے لگ جائیں جو قرن اول میں پیدا
ہوا کرتے تھے۔ یاد رکھئے ایمان اور اعمال صالحہ اگر صحیح اسلامی نظام کے ماتحت
وجود پذیر ہوں تو اُن کا فطری نتیجہ قوت اور اقتدار ہے، جس سے تمکن فی الارض
حاصل ہوتا ہے اور یہی تمکن اس جماعت الٰہیہ کے استحکام و استبقاء، کا موجب اور
اس کے مرکزی فیصلوں کی تنفیذ کا ذریعہ بنتا ہے۔ آپ شاید کہہ دیں کہ آج جبکہ
ملت اسلامیہ میں اس قدر اختلافات پیدا ہو چکے ہیں نظام اسلامی کا مرکز کس طرح
فیصلہ کرے گا کہ وہ دین حقیقی کونسا تھا جو نبی اکرم امت کو دے کر گئے تھے۔ لیکن
یہ مشکل صرف آج حوصلہ شکن نظر آتی ہے اسلامی نظام وجود میں آجائے تو یہ مشکل
مشکل رہتی ہی نہیں۔ اندھیرے کی تو فطرت ہے کہ چراغ آجائے تو وہ خود بخود
مٹ جائے۔ دین کی بنیاد قرآن پر ہے۔ وہ ہمارے پاس موجود ہے، جزئیات
کی ترتیب کے لئے اُمت کی مجلس مشاورت اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر
خود فیصلے کرے گی اُن فیصلوں میں مدد دینے کے لئے اس علمی سرمایہ سے بھی کام
لیا جائے گا جو ہمارے پاس وراثتاً چلا آرہا ہے اگر اُسے اس طریق سے پرکھا جائے
تو اس میں بہت سی کام کی چیزیں مل جائیں گی۔ آج اس ڈھیر سے غث و ثمین کا
الگ کرنا اس لئے دشوار ہے کہ الگ کرنے والے پہلے ہی ایک خاص چشمہ لگا کر

تلاش شروع کرتے ہیں، جب جماعت کے سامنے قرآن ہو تو اُس کے لئے ڈھیر سے کام کی چیزوں کا چن لینا دشوار نہیں ہوتا۔ تفسیرِ قرآن۔ تعدیلِ احادیث۔ تدوینِ فقہ اس جماعت کا کام ہوگا نہ کہ افراد کا۔ اس جماعت کے فیصلے مرکزِ ملت کی مہرِ مصدق ہو کر نافذ ہوں گے جو امت کے لئے واجب العمل ہوں گے اور اُن کی اطاعت "خدا اور رسول کی اطاعت" ہوگی؛ جن فیصلوں پر مرکز کی مہر نہ ہوگی اُن کی دینی حیثیت کچھ نہیں ہوگی۔ اس طرح تفریق، جو انفرادیت کے شجرِ ممنوعہ کا تلخ ترین ثمر ہے، مٹ جائے گی۔ اور اس کی جگہ وحدت، جو اجتماعیت کے نخلِ طیّب کا برشیریں ہے پیدا ہو جائے گی اور وہی دین جو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک باقی رہنے کے لئے پسند فرمایا تھا، اپنی عملی شکل میں رائج ہو جائے گا۔ اور لیظھرہٗ علی الدین کلّہٖ (تمام ادیان پر غلبہ) کی بشارت کے ماتحت تمام کائنات کو محیط ہو جائے گا کہ اسلام کا شجرِ طیب شرق و غرب کے امتیازات سے ناآشنا اور اس کے بحرِ مواج کوہ و دمن کے جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد ہے۔

ایک نکتہ کی تصریح

ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب نبی اکرم ص کے تشریف لیجانے کے بعد خدا اور رسول کی اطاعت آپ کے جانشین (یعنی مرکزِ ملت) کی اطاعت میں منتقل ہو گئی تو کیا اس مرکزِ ملت کو یہ اختیارات حاصل ہوں گے کہ وہ ملت کے وقتی مصالح کے

پیشِ نظر تمام معاملات میں ردّ و بدل کر سکے ، یا ایسے امور بھی ہوں گے جن وہ تغیر و تبدل کا مجاز نہ ہو گا - ؟

یہ سوال بھی اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہماری نگاہوں سے اسلامی نظام اوجھل ہو چکا ہے ، ورنہ ظاہر ہے کہ حضورؐ کے جانشین ، دین کے ان معاملات میں جو نا قابلِ تغیر ہیں ۔کسی قسم کے ردّ و بدل کا خیال تک بھی دل میں لا سکتے ہیں ؟ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بیعتِ خلافت کے بعد سب سے پہلے خطبہ میں اپنی پوزیشن کو ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ " انی متبع لست بمبتدع " میں تو اتباع کرنے والا ہوں نہ کہ (دین کے معاملہ میں نئی نئی باتیں پیدا کرنے والا) اور اسی طرح بعد کے خلفائے راشدینؓ اپنے پیش رو خلفا کی متابعت کا اعلان کرتے رہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کے اصول اور اس کی متعین کردہ جزئیات غیر متبدل ہیں ۔ اب رہیں وہ جزئیات ، جو کسی سابقہ مرکزِ ملت نے متعین کی تھیں سو اُن کے متعلق یہ فیصلہ کہ کون کون سی جزئیات ایسی ہیں کہ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے اور کونسی ایسی ہیں جن میں تبدیلی کی ضرورت ہے مرکزِ ملت ہی کر سکتا ہے ، نہ کہ افرادِ ملت ۔ افراد کے لئے تو مرکز کی اطاعت ہی خدا اور رسول کی اطاعت ہو گی ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے جب زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا تو فرمایا تھا کہ جب تک ہر وہ شے جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں بیت المال میں داخل کی جاتی تھی مرکزی بیت المال میں داخل نہ کی جائے گی اس وقت تک میں جہاد سے نہیں رکوں گا ۔ چنانچہ اُس وقت اس

فیصلہ کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت تھی۔ لیکن اس کے بعد جب حضرت عثمانؓ نے اجازت فرما دی کہ زکوٰۃ کا روپیہ مرکزی بیت المال میں جمع کرنے کے بجائے اپنی مقامی ضروریات کے صرف میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ تو ہر چند یہ طریق عمل نبی اکرمؐ اور حضرات شیخین کے زمانہ کے طریق عمل کے خلاف تھا۔ لیکن افراد ملت کے لئے اس کی اطاعت بھی خدا اور رسول کی اطاعت تھی۔ اس لئے کہ جب صحیح اسلامی نظام قائم ہو امت کے بہترین منتخبہ افراد کے اجتماع سے مجلس مشاورت عمل میں آئی ہو۔ اور ان میں سے بہترین تقویٰ شعار مومن قانت ان کا امام ہو، قرآن کریم اُن کا خضر راہ اور نبی اکرمؐ سے لے کر اپنے وقت تک کے تمام پیش رو خلفاء کے فیصلے بطور نظائر اُن کے سامنے ہوں تو اُن کے لئے اس امر کا فیصلہ کچھ مشکل نہیں ہو گا کہ اُن کے زمانے کے تقاضے کس کس تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ طواف کعبہ اور سعی بین الصفا والمروہ میں مسلمانوں کو اکڑ کر چلنا چاہیئے۔ حضورؐ کے بعد حضرت عمرؓ نے اس حکم کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ وہ مصالح جن کے ماتحت وہ حکم دیا گیا تھا اب باقی نہیں رہے۔ اس لئے اس حکم کی تعمیل بھی ضروری نہیں رہی۔ اسی طرح نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں نماز جمعہ کے لئے صرف ایک اذان دی جاتی تھی، لیکن حضرت عثمانؓ نے ایک اذان اور بڑھا دی لیکن یہ فریضہ تھا مرکز ملت کا، جب سے اس قسم کے فیصلے افراد کے ہاتھ میں آگئے دین کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اور اب باوجود ادعائے اطاعت خدا و رسول یقینی

طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ۔ اطاعت خدا و رسول " ٹھیک ٹھیک کہاں ہو رہی ہے اس کا تعین مرکزِ ملت کا کام ہوگا۔

حرفِ آخر میں جانتا ہوں کہ کورانہ تقلید کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں آپ کو اس طرف آنے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گی عقیدت مندی کا غلط مفہوم بھی عناں گیر ہوگا گوناگوں وساوس کے کانٹے بھی دامن سے اُلجھیں گے، جمود اور تعطل کے سنگ گراں رستہ کو روکیں گے۔ لیکن میں آپ سے اتنی گزارش کروں گا کہ آپ ایک مرتبہ ان باتوں سے خالی الذہن ہو کر سوچیں کہ جس افتراق و انتشار میں مسلمان آج مبتلا ہیں۔ کیا اسلام کا منشا یہی تھا؟ اگر نہیں، تو کیا آپ پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا کہ اسلام کو پھر سے اُس کی اصلی شکل میں رائج کرنے کی کوشش کریں۔ آج جتنی کوششیں ہو رہی ہیں، اپنے اپنے فرقہ کو "اصلی اسلام" قرار دیکر اسی فرقہ کی ترویج و اشاعت میں ہو رہی ہیں اور یوں مختلف فرقوں کی دیواریں ہو کر وحدتِ اسلامی کے ٹکرے کر رہی ہیں یہ دیواریں گر جائیں تو دشتِ حجاز سے اُٹھے ہوئے دین کی وحدت پھر سے قائم ہو جائے۔ ان دیواروں کے انہدام سے آپ کے لئے گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ جن امور کو آپ صحیح سمجھتے ہیں نظامِ دین کی تشکیل کے بعد یہ متحقق ہو جائے کہ وہی اُمور درست ہیں۔ اُس صورت میں آپ کی موجودہ روش کو مرکز کی سند حاصل ہو جائے گی۔ اور اگر وہ مسلک غلط ثابت

ہو گیا تو آپ ضلالت کی راہ سے بچ کر صراط مستقیم پر آجائیں گے وہ وقت ایسا ہوگا لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ جو زندہ رکھنے کے قابل ہوگا وہ علیٰ وجہ البصیرت رکھا جائے گا اور جو مٹا دینے کے قابل ہوگا وہ علیٰ وجہ البصیرت مٹا دیا جائے گا۔

خلاصہ مبحث گذشتہ اوراق میں جو کچھ آپ کے مطالعہ سے گذرا اس سے اسلامی نظام کا بنیادی اصول آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اس نظام کے بنیادی خط و خال حسب ذیل ہیں

(۱) انسانی زندگی کے مسائل کا حل قرآن کی راہنمائی کے بغیر ناممکن ہے۔

(۲) دنیا میں وہی نظام اسلامی کہلا سکتا ہے جو قرآن کی بنیادوں پر استوار ہو۔

(۳) قرآن میں بہت تھوڑے احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی خود قرآن کے اندر موجود ہیں باقی احکام کے متعلق صرف اصول دیئے گئے ہیں۔

(۴) قرآن کی متعین کردہ جزئیات اور اس کے اصول احکام سب غیر متبدل ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی

(۵) قرآن نے جن اصولوں کی جزئیات خود متعین نہیں کیں اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کی جزئیات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہیں رہیں گی بلکہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ادلتی بدلتی رہیں گی مثلاً قرآن میں ہے اٰتُوا الزَّكٰوةَ زکوٰۃ دو۔ یہ ایک اصولی حکم ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا کہ زکوٰۃ کتنی ہوگی۔ کس کس مال پر

ہو گی، کب دی جائے گی وغیرہ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآن کا یہ اصولی حکم تو غیر متبدل رہے گا لیکن اس کی تفصیلات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔

(۶) ان جزئیات کے متعین کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی پارلیمان اپنے وقت کی ضروریات پر غور کرے اور اُن کے مطابق قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئی قانون مرتب کرے۔ جب یہ قوانین اسلامی حکومت کی طرف سے نافذ ہوں گے تو ان کا نام اسلامی شریعت ہو گا۔

(۷) قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور اسلامی شریعت زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہے گی۔

(یہ ہے اسلامی نظام کا بنیادی اصول)

اسلامی نظام

کے اصول آپ کے سامنے آ گئے۔ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے
ہوں کہ پاکستان میں یہ نظام کس طرح نافذ کیا جا سکتا
ہے اور اس کی تفاصیل کیا ہوں گی، تو

قرآنی دستورِ پاکستان

ملاحظہ کیجئے، جو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے حال ہی میں
شائع ہوا ہے اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ جائے گی
کہ اگر پاکستان میں قرآنی نظام رائج ہو جائے تو یہ زمین کیا
سے کیا ہو جائے!

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کراچی

طلوع اسلام

کا

مقصد اور مسلک

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

(۱) تنہا فکر انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی

(۲) یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

(۳) حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

(۴) حضور نبی اکرمؐ، انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب

میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

(۵) قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان، ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

(۶) اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانہ کے انسان اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قوانین شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے۔ لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

(۷) اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسان کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔)

(۸) ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کیلئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے اسے قرآنی نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ابتداً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں، قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشو و نما پا سکیں اور اس طرح

"زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں **طلوع اسلام** کا ساتھ دیجیے۔

(ادبی پریس کراچی)